جاوید احمد غامدی

# خدا کے فیصلے



رسولوں کی طرف سے اتمام حجت کے بعد اگر اُن کو اور اُن کے ساتھیوں کو کسی خطۂ ارض میں اقتدار حاصل ہو جائے تو خدا کا فیصلہ ہے کہ اُن کے منکرین کے لیے دو ہی صورتیں ہیں: اُن میں اگر مشرکین ہوں گے تو قتل کر دیے جائیں گے اور کسی نہ کسی درجے میں توحید کے ماننے والے ہوں گے تو محکوم بنا لیے جائیں گے۔ بقرہ، انفال اور توبہ میں* اللہ تعالیٰ نے جس قتال کی ہدایت فرمائی اور مشرکین عرب کے جس قتل عام کا حکم دیا ہے، وہ اِسی فیصلے کا نفاذ ہے۔ اِس کا شریعت اور اُس کے احکام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ چنانچہ اپنی کتاب ''میزان'' میں ہم نے لکھا ہے:

''...یہ محض قتال نہ تھا، بلکہ اللہ تعالیٰ کا عذاب تھا جو اتمام حجت کے بعد سنت الٰہی کے عین مطابق اور فیصلۂ خداوندی کی حیثیت سے پہلے عرب کے مشرکین اور یہود و نصاریٰ پر اور اُس کے بعد عرب سے باہر کی قوموں پر نازل کیا گیا۔ لہٰذا یہ بالکل قطعی ہے کہ منکرین حق کے خلاف جنگ اور اِس کے نتیجے میں مفتوحین پر جزیہ عائد کر کے اُنھیں محکوم اور زیردست بنا کر رکھنے کا حق اِس کے بعد ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا ہے۔ قیامت تک کوئی شخص اب نہ دنیا کی کسی قوم پر اِس مقصد سے حملہ کر سکتا ہے اور نہ کسی مفتوح کو محکوم بنا کر اُس پر جزیہ عائد کرنے کی جسارت کر سکتا ہے۔ مسلمانوں کے لیے قتال کی ایک ہی صورت باقی رہ گئی ہے اور وہ ظلم و عدوان کے خلاف جنگ ہے۔ اللہ کی راہ میں قتال اب یہی ہے۔ اِس کے سوا کسی مقصد کے لیے بھی دین کے نام پر جنگ نہیں کی جا سکتی۔'' (۵۹۹)

ابراہیم علیہ السلام کی ذریت کے بارے میں بھی خدا کا فیصلہ ہے کہ وہ اگر حق پر قائم ہوں اور اُسے بے کم و کاست اور پوری قطعیت کے ساتھ دنیا کی سب قوموں تک پہنچاتے رہیں تو اُن کی دعوت کے منکرین پر اُنھیں غلبہ حاصل ہو گا، لیکن

* البقرہ ۲: ۱۹۰-۱۹۴۔ الانفال ۸: ۳۸-۴۰۔ التوبہ ۹: ۲۹، ۳-۵۔

حق سے انحراف کریں تو اُنھی کے ذریعے سے ذلت اور محکومی کے عذاب میں مبتلا کر دیے جائیں گے۔ یہ وعدہ بنی اسرائیل اور بنی اسمٰعیل، دونوں کے ساتھ ہے۔ قرآن میں صراحت ہے کہ دین کی شہادت کے لیے بنی اسمٰعیل بھی اُسی طرح منتخب کیے گئے، جس طرح اُن سے پہلے بنی اسرائیل منتخب کیے گئے تھے*۔ لہٰذا جو وعدے بنی اسرائیل کے لیے تورات میں مذکور ہیں اور قرآن نے جگہ جگہ جن کا حوالہ دیا ہے**، وہ اُن کے متعلق بھی آپ سے آپ تسلیم کیے جائیں گے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ اِس کے لیے خود کوئی اقدام کر سکتے اور دنیا کی قوموں پر اِس مقصد کے لیے حملہ آور ہو سکتے ہیں۔ ہرگز نہیں، اِس کا حق نہ اُنھیں تورات میں دیا گیا ہے نہ قرآن میں۔ اِس وعدے کا ظہور تکوینی طور پر ہوتا ہے اور اِس کے اسباب بھی اِسی طریقے سے پیدا کیے جاتے ہیں۔ اُن کا کام صرف یہ ہے کہ خدا کے سب حکموں پر عمل کریں اور اپنی استطاعت کی حد تک شہادت کی وہ ذمہ داری اخلاص اور دیانت داری کے ساتھ پوری کرتے رہیں جس کے لیے خدا نے اُنھیں منتخب فرمایا ہے۔

اِس فیصلے کی ایک فرع یہ ہے کہ فلسطین اور اُس کے گردونواح میں کنعان کا علاقہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے لیے اور جزیرہ نماے عرب کا علاقہ بنی اسمٰعیل کے لیے خاص کر دیا ہے تاکہ دنیا کی سب قومیں اُن کے ساتھ اُس کی معیت کا مشاہدہ کریں اور ہدایت پائیں۔ چنانچہ بنی اسرائیل کو اِسی بنا پر حکم دیا گیا کہ اپنی میراث کے اِس علاقے کو اُس کے باشندوں سے خالی کرا لیں، اُس میں کسی کافر و مشرک کو زندہ نہ چھوڑیں اور نہ اُس کی سرحدوں سے متصل کسی علاقے میں کافروں اور مشرکوں کی کوئی حکومت قائم رہنے دیں، الاّ یہ کہ وہ اُن کے باج گزار بن جائیں۔ وہ اِس سے انکار کریں تو سزا کے طور پر اُن کے مرد قتل کر دیے جائیں اور عورتوں اور بچوں کو غلام بنا لیا جائے۔ استثنا کے باب ۲۰ میں یہ حکم پوری تفصیل کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ سلیمان علیہ السلام نے ملکۂ سبا کو اِسی کے تحت تسلیم و انقیاد کے لیے مجبور کیا تھا۔ فتح مکہ کے بعد جزیرہ نماے عرب میں مشرکین کے تمام معابد اِسی کے تحت ختم کیے گئے۔ 'لا یجتمع دینان فی جزیرة العرب'*** کی ہدایت بھی اِسی کے تحت ہے۔ چنانچہ سرزمین عرب میں اِسی بنا پر نہ غیر اللہ کی عبادت کے لیے کوئی معبد تعمیر کیا جا سکتا ہے اور نہ کسی کافر و مشرک کو رہنے بسنے کی اجازت دی جا سکتی ہے۔ یہ تمام احکام توحید کے

---

* الحج ۲۲: ۷۸۔

** استثنا ۲۸: ۱-۲۵۔ البقرہ ۲: ۴۰۔ بنی اسرائیل ۱۷: ۸۔

*** الموطا، رقم ۲۶۰۷۔ ''جزیرہ نماے عرب میں دو دین جمع نہیں ہو سکتے۔''

اِسی مرکز سے متعلق ہیں۔ اِن کا دنیا کے کسی دوسرے علاقے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

یہ خدا کے منصوص فیصلے ہیں اور الہامی صحائف میں بڑی وضاحت کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔ تورات میں بھی اِنھیں پوری تفصیل کے ساتھ واضح کیا گیا ہے اور قرآن میں بھی۔ مسلمانوں کی بدقسمتی ہے کہ دور حاضر میں اُن کے بعض جلیل القدر مفکرین اِن فیصلوں کی صحیح نوعیت کو سمجھنے سے قاصر رہے ہیں۔ اسلام کی سیاسی تعبیر اِسی غلط فہمی کے بطن سے پیدا ہوئی ہے، جس کا نتیجہ اِس تعبیر کے زیر اثر اٹھنے والی جہاد و قتال کی تحریکوں کی صورت میں پوری امت مسلمہ بھگت رہی ہے۔ اِس صورت حال کی اصلاح کے لیے ضروری ہے کہ خدا کے اِن فیصلوں کو عالمی سطح پر سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی جائے تاکہ کسی انتہا پسند کے لیے اِن کی تعمیم کے ذریعے سے کوئی فتنہ پیدا کرنے کی گنجایش نہ رہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# سورة الانعام

(۱۱)

(گذشتہ سے پیوستہ)



فَكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ بِاٰيٰتِهٖ مُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱۸﴾ وَمَا لَكُمْ
اَلَّا تَاْكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ اِلَّا مَا

---

سو (پروا نہ کرو[185] اور) اگر اُس کی آیتوں پر ایمان رکھتے ہو[186] تو جن جانوروں پر اللہ کا نام لیا گیا ہو، اُنھیں (بغیر کسی تردد کے) کھاؤ اور تم اُن چیزوں میں سے کیوں نہ کھاؤ جن پر اللہ کا نام لیا گیا ہو، دراں حالیکہ

---

۱۸۵؎ یعنی اِن کے اُس پروپیگنڈے کی پروا نہ کرو جو یہ تمھاری اصلاحات کے خلاف کر رہے ہیں کہ یہ شخص وہ چیزیں بھی جائز ٹھیرا رہا ہے جو ہمارے بزرگوں ـــــ ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام ـــــ کے زمانے سے حرام چلی آ رہی تھیں۔ یہ اِن کے ظنون و اوہام ہیں۔ ابراہیم و اسمٰعیل کا دین درحقیقت وہی تھا جو اِس وقت اِن کے سامنے شرک و بدعت کی تمام آلایشوں سے پاک کر کے پیش کیا جا رہا ہے۔

۱۸۶؎ یہ تاکید اور تنبیہ، بلکہ ایک نوعیت کی تہدید بھی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...تحریم و تحلیل کا اختیار صرف اللہ کو حاصل ہے۔ اگر کسی اور کے لیے بھی یہ حق تسلیم کر لیا جائے تو یہ خدا کے حقوق میں دوسرے کو حصہ دار بنانا ہے اور یہ شرک ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ مسئلہ صرف ایک چیز کے کھانے اور نہ کھانے کا نہیں ہے، بلکہ جن چیزوں کو مشرکانہ توہمات کی بنا پر حرام ٹھیرایا گیا ہے، اللہ کی طرف سے اُن کی حلت کے اعلان کے باوجود اُن سے

اضْطُرِرْتُمْ اِلَيْهِ وَاِنَّ كَثِيْرًا لَّيُضِلُّوْنَ بِاَهْوَآئِهِمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ
بِالْمُعْتَدِيْنَ ﴿۱۱۹﴾ وَذَرُوْا ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَبَاطِنَهٗ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْسِبُوْنَ الْاِثْمَ
سَيُجْزَوْنَ بِمَا كَانُوْا يَقْتَرِفُوْنَ ﴿۱۲۰﴾ وَلَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ

---

اُس نے جو کچھ تم پر حرام ٹھیرایا ہے، وہ (اپنی کتاب میں) تفصیل سے بیان کر دیا ہے[187]، اِس استثنا کے ساتھ کہ تم کسی چیز (کو کھانے) کے لیے مجبور ہو جاؤ[188]۔ حقیقت یہ ہے کہ زیادہ لوگ بغیر کسی علم کے اپنی بدعتوں[189] کے ذریعے سے گمراہی پھیلاتے ہیں۔ اِن حد سے بڑھنے والوں کو تیرا پروردگار خوب جانتا ہے۔ تم اِس گناہ کے ظاہر و باطن، دونوں کو چھوڑ دو[190]۔ جو لوگ اِس گناہ کا اکتساب کرتے ہیں، وہ عنقریب

---

اجتناب کرنا گویا بالواسطہ شرک کو تسلیم کرنا ہوا، اِس وجہ سے یہ مسئلہ کفر و ایمان کا مسئلہ بن جاتا ہے۔'' (تدبر قرآن ۳/ ۱۵۴)

۱۸۷؎ یہ اُس تفصیل کی طرف اشارہ ہے جو اِس سورہ میں بھی ہے اور قرآن کے بعض دوسرے مقامات میں بھی کی گئی ہے۔

۱۸۸؎ اِس استثنا کے حدود و شرائط اِس سے پہلے سورۂ بقرہ اور سورۂ مائدہ میں بیان ہو چکے ہیں۔

۱۸۹؎ اصل میں لفظ 'اَھْوَآء' آیا ہے۔ اِس کے معنی خواہشات کے ہیں، لیکن سیاق کلام سے واضح ہے کہ یہاں اِس سے مراد وہ مشرکانہ بدعتیں ہیں جو محض خواہشات کی بنیاد پر دین بنالی جاتی ہیں۔ 'بِغَيْرِ عِلْمٍ' کے الفاظ اِسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

۱۹۰؎ یعنی شرک کے ظاہر و باطن کو چھوڑ دو۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...شرک کی ایک تو حقیقت ہے، جو یہ ہے کہ خدا کی ذات یا صفات یا اُس کے حقوق میں کسی کو شریک ماننا۔ دوسرے اُس کے مظاہر و اشکال ہیں، مثلاً اصنام، انصاب، ازلام، بحیرہ، سائبہ، وصیلہ، حام اور اِس نوع کی دوسری چیزیں جو کسی شرکیہ عقیدے یا تصور کا عملی مظہر اور نشان ہیں۔ ظاہر ہے کہ اِن دونوں میں بڑا گہرا ربط ہوتا ہے۔ یہ ایک دوسرے کے سہارے سے پروان چڑھتی اور غذا و قوت حاصل کرتی ہیں۔ اِس وجہ سے اگر کسی برائی کا استیصال مقصود ہو تو یہ ضروری ہوگا کہ اُس برائی کی حقیقت اور اُس کے مظاہر و اشکال، دونوں کا استیصال کیا جائے۔ اِس کے بغیر اُس کا استیصال ناممکن ہے۔ اگر یہ خیال کر کے اشکال و مظاہر سے چشم پوشی برتی جائے کہ جب اصل برائی پر ضرب لگا دی گئی تو اشکال و مظاہر میں کیا رکھا ہوا ہے تو وہ برائی اِنھی اشکال میں پھر اپنا نشیمن بنا کر اُس میں اپنے

وَاِنَّهٗ لَفِسْقٌ وَاِنَّ الشَّيٰطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ اِلٰٓى اَوْلِيٰٓئِهِمْ لِيُجَادِلُوْكُمْ وَاِنْ اَطَعْتُمُوْهُمْ اِنَّكُمْ لَمُشْرِكُوْنَ ﴿۱۲۱﴾

اپنی اِس کمائی کا بدلہ پا لیں گے۔ اور اُن جانوروں میں سے بھی ہرگز نہ کھاؤ جن پر اللہ کا نام نہیں لیا گیا، یہ نافرمانی ہے[۱۹۱] اور شیاطین اپنے ایجنٹوں کو القا کر رہے ہیں کہ وہ (اِس معاملے میں) تم سے جھگڑیں[۱۹۲]۔ (اِس لیے متنبہ رہو کہ) اگر اِن کا کہا مانو گے تو تم بھی مشرک ہو جاؤ گے[۱۹۳]۔ ۱۱۸-۱۲۱

انڈوں بچوں کی پرورش شروع کر دیتی ہے اور آہستہ آہستہ اُس کا پورا کنبہ از سر نو آباد ہو جاتا ہے۔''

(تدبر قرآن ۳/۱۵۶)

۱۹۱؎ یہ قرآن نے مزید وضاحت فرما دی ہے کہ جس ذبیحہ پر غیر اللہ کا نام تو نہیں لیا گیا، مگر اللہ کا نام بھی نہیں لیا گیا، وہ بھی اُسی حکم کے تحت ہے جو قرآن میں جانوروں کی حرمت سے متعلق بیان ہوا ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے کہ جس طرح 'مَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ' فسق، یعنی نافرمانی ہے، اُسی طرح یہ بھی فسق ہے۔ اِس کے وجوہ کیا ہیں؟ استاذ امام لکھتے ہیں:

''اول یہ کہ اللہ کے نام اور اُس کی تکبیر کے بغیر جو کام بھی کیا جاتا ہے وہ، جیسا کہ ہم آیت بسم اللہ کی تفسیر میں واضح کر چکے ہیں، برکت سے خالی ہوتا ہے۔ خدا کی ہر نعمت سے، خواہ وہ چھوٹی ہو یا بڑی، فائدہ اٹھاتے وقت ضروری ہے کہ اُس پر اُس کا نام لیا جائے تاکہ بندوں کی طرف سے اُس کے انعام و احسان کا اعتراف و اقرار ہو۔ اِس اعتراف و اقرار کے بغیر کوئی شخص کسی چیز پر تصرف کرتا ہے تو اُس کا یہ تصرف غاصبانہ ہے اور غصب سے کوئی حق قائم نہیں ہوتا، بلکہ یہ جسارت اور ڈھٹائی ہے جو خدا کے ہاں مستوجب سزا ہے۔

دوم یہ کہ احترام جان کا یہ تقاضا ہے کہ کسی جانور کو ذبح کرتے وقت اُس پر خدا کا نام لیا جائے۔ جان کسی کی بھی ہو، ایک محترم شے ہے۔ اگر خدا نے ہم کو اجازت نہ دی ہوتی تو ہمارے لیے کسی جانور کی بھی جان لینا جائز نہ ہوتا۔ یہ حق ہم کو صرف خدا کے اذن سے حاصل ہوا ہے۔ اِس وجہ سے یہ ضروری ہے کہ جس وقت ہم اُن میں سے کسی کی جان لیں، صرف خدا کے نام پر لیں۔ اگر اُن پر خدا کا نام نہ لیں یا خدا کے نام کے ساتھ کسی اور کا نام لے لیں یا کسی غیر اللہ کے نام پر اُن کو ذبح کر دیں تو یہ اُن کی جان کی بھی بے حرمتی ہے اور ساتھ ہی جان کے خالق کی بھی۔

سوم یہ کہ اِس سے شرک کا ایک بہت وسیع دروازہ بند ہو جاتا ہے۔ ادیان کی تاریخ پر جن لوگوں کی نظر ہے، وہ جانتے ہیں کہ جانوروں کی قربانی، اُن کی نذر اور اُن کے چڑھاوے کو ابتدائے تاریخ سے عبادات میں بڑی اہمیت

اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ
فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْكٰفِرِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۲﴾

(تم اِن کی پروا نہ کرو)۔ کیا جو مردہ تھا، پھر ہم نے اُسے زندہ کر دیا اور ایک ایسی روشنی عطا فرمائی جسے وہ لوگوں کے درمیان لے کر چل رہا ہے[۱۹۴]، اُس شخص کے مانند ہو جائے گا جو تاریکیوں[۱۹۵] میں پڑا ہوا

حاصل رہی ہے۔ اِس اہمیت کے سبب سے مشرکانہ مذاہب میں بھی اِس کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔ جو قوم بھی کسی غیر اللہ کی عقیدت و نیازمندی میں مبتلا ہوئی، اُس نے مختلف شکلوں سے اِس غیر اللہ کو راضی کرنے کے لیے جانوروں کی بھینٹ چڑھائی۔ قرآن میں شیطان کی جو دھمکی انسانوں کو گمراہ کرنے کے باب میں مذکور ہوئی ہے، اُس میں بھی، جیسا کہ ہم اُس کے مقام میں واضح کر چکے ہیں، اِس ذریعۂ ضلالت کا شیطان نے خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ اسلام نے شرک کے اِن تمام راستوں کو بند کر دینے کے لیے جانوروں کی جانوں پر اللہ تعالیٰ کے نام کا قفل لگا دیا، جس کو خدا کے نام کی کنجی کے سوا کسی اور کنجی سے کھولنا حرام قرار دے دیا گیا۔ اگر اِس کنجی کے بغیر کسی اور کنجی سے اُس کو کھولنے یا اُس کو توڑنے کی کوشش کی گئی تو یہ کام بھی ناجائز اور جس جانور پر یہ ناجائز تصرف ہوا، وہ جانور بھی حرام۔''

(تدبر قرآن ۳/ ۱۵۷)

۱۹۲؎ یعنی اُسی طرح کا غوغا برپا کرنے کی ترغیب دے رہے ہیں جو اِن لوگوں نے اپنی قرارداده بعض حرمتوں کی حلت کا سن کر برپا کر رکھا ہے۔ چنانچہ اپنے ایجنٹوں کو بتا رہے ہیں کہ لو اب یہ نیا دین لے کر آنے والے تمھارے سب باپ دادوں کو حرام خور قرار دے رہے ہیں جو اللہ کا نام لیے بغیر جانوروں کو ذبح کرتے اور اُن کا گوشت کھاتے رہے ہیں۔

۱۹۳؎ یعنی ایک مرتبہ اِن کے توہمات سے سمجھوتا کر لو گے تو آہستہ آہستہ شرک کے دوسرے مظاہر بھی تمھارے علم و عقیدہ میں در آئیں گے جس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ بالآخر مشرک ہو کر رہ جاؤ گے۔

۱۹۴؎ یہ ایمان والوں کی تمثیل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جن پر کفر و جہالت کی موت طاری تھی، پھر اللہ تعالیٰ نے اُنھیں ایمان کی زندگی بخشی اور اُن کی رہنمائی کے لیے ایک ایسی کتاب اُنھیں عطا فرمائی جس کی روشنی میں اب وہ حق و باطل کو الگ الگ دیکھ سکتے، حق کے راستے پر چل سکتے اور دوسروں کو بھی یہی راہ دکھا سکتے ہیں۔

۱۹۵؎ اِس سے مراد ظنون و اوہام اور خواہشات و بدعات کی وہ تاریکیاں ہیں جن کا ذکر اوپر ہوا ہے۔

وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنَا فِیْ كُلِّ قَرْیَةٍ اَكٰبِرَ مُجْرِمِیْهَا لِیَمْكُرُوْا فِیْهَا وَمَا یَمْكُرُوْنَ
اِلَّا بِاَنْفُسِهِمْ وَمَا یَشْعُرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾ وَاِذَا جَآءَتْهُمْ اٰیَةٌ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ حَتّٰی
نُؤْتٰی مِثْلَ مَآ اُوْتِیَ رُسُلُ اللّٰهِ اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَیْثُ یَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ سَیُصِیْبُ
الَّذِیْنَ اَجْرَمُوْا صَغَارٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَ عَذَابٌ شَدِیْدٌۢ بِمَا كَانُوْا یَمْكُرُوْنَ ﴿۱۲۴﴾

ہے، کسی طرح اُن سے نکلنے والا نہیں ہے؟[۱۹۶] اِن منکروں کے اعمال اِن کے لیے اِسی طرح خوش نما بنا دیے گئے ہیں۔[۱۹۷] ہر بستی میں اُس کے بڑے بڑے مجرموں کو ہم نے اِسی طرح ڈھیل دی[۱۹۸] کہ اُس میں اپنی چالیں چل لیں۔ وہ یہ چالیں اپنے ساتھ ہی چلتے تھے، مگر اُنھیں اِس کا احساس نہیں تھا۔[۱۹۹] جب اُن کے سامنے کوئی آیت آتی تو کہتے تھے: ہم نہیں مانیں گے، جب تک وہی ہم کو نہ دیا جائے جو اللہ کے رسولوں کو دیا گیا ہے۔[۲۰۰] اللہ بہتر جانتا ہے کہ اپنی رسالت کا منصب کسے عطا فرمائے۔[۲۰۱] اللہ کے ہاں یہ مجرم

۱۹۶؎ یہ تمثیل اہل ایمان کی حوصلہ افزائی کے لیے بیان کی گئی ہے۔ مدعا یہ ہے کہ اُنھیں جو کچھ عطا ہوا ہے، اُسے وہ کوئی معمولی چیز نہ سمجھیں، اُس کی قدر کریں اور اُس کا زندگی بخش پیغام دوسروں تک پہنچائیں اور اُن لوگوں کی خرافات پر کان نہ دھریں جو اپنے کرتوتوں کی بنا پر اندھیروں میں ٹھوکریں کھانے کے لیے چھوڑ دیے گئے ہیں۔

۱۹۷؎ یعنی کفر و جہالت کی جس تاریکی کو اُنھوں نے اپنے لیے اختیار کیا ہے، خدا نے وہی تاریکی اُن کے لیے پسندیدہ بنا دی ہے۔

۱۹۸؎ اصل میں لفظ 'جَعَلْنَا' آیا ہے۔ یہ یہاں 'امھلنا' کے مفہوم میں ہے۔ ہم نے ترجمہ اِسی کے لحاظ سے کیا ہے۔

۱۹۹؎ مطلب یہ ہے کہ وہ یہ چالیں بظاہر حق کے خلاف، مگر حقیقت میں اپنے خلاف ہی چلتے تھے۔ اِس کے لیے جو الفاظ اصل میں آئے ہیں، اُن میں فعل ناقص عربیت کے قاعدے سے محذوف ہے۔

۲۰۰؎ یہ اُن چالوں کی ایک مثال ہے جن کا ذکر ہوا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...ٹھیک یہی بات، جیسا کہ قرآن میں تفصیل سے بیان ہوئی، قریش کے اکابر کہتے تھے۔ اُن کو بھی وہی گھمنڈ تھا جو اُن کے پیشرو مستکبرین اور مکذبین انبیا کو تھا کہ اگر خدا کسی کو رسالت ہی دینے والا تھا تو کیا اِس تاج کے لیے اُس کو

فَمَنۡ یُّرِدِ اللّٰہُ اَنۡ یَّہۡدِیَہٗ یَشۡرَحۡ صَدۡرَہٗ لِلۡاِسۡلَامِ وَمَنۡ یُّرِدۡ اَنۡ یُّضِلَّہٗ یَجۡعَلۡ صَدۡرَہٗ ضَیِّقًا حَرَجًا کَاَنَّمَا یَصَّعَّدُ فِی السَّمَآءِ کَذٰلِکَ یَجۡعَلُ اللّٰہُ الرِّجۡسَ

عنقریب اپنی مکاریوں کی پاداش میں ذلت اور عذاب شدید سے دوچار ہو جائیں گے۔ (یہ ہدایت پانے والے نہیں ہیں)، اِس لیے کہ اللہ (اپنے قانون کے مطابق[202]) جس کو ہدایت دینا چاہتا ہے، اُس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے اور جسے گمراہ کرنا چاہتا ہے، اُس کا سینہ تنگ کر دیتا اور ایسا بھینچتا ہے گویا اُسے

اِنھی (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کا سرموزوں نظر آیا، آخر مکہ یا طائف کے کسی سردار پر اُس کی نظر کیوں نہ پڑی؟ ظاہر ہے کہ یہ بات جو وہ کہتے تھے تو محض چالبازی کے طور پر کہتے تھے، اِس سے مقصود اُن کا محض اپنی انانیت اور خودفریبی کے لیے ایک پردہ فراہم کرنا اور اپنے عوام کو بے وقوف بنانا ہوتا تھا۔ سادہ لوح عوام دنیوی اسباب و وسائل کو بڑی چیز سمجھتے ہیں۔ وہ جن کو دنیا میں بڑا دیکھتے ہیں، سمجھتے ہیں کہ خدا کے نزدیک بھی یہی بڑے ہوں گے۔ اِس ذہن کے لوگ آسانی سے اِس قسم کے چکموں میں آجاتے ہیں۔ اِسی وجہ سے قرآن نے اس بات کو مکر سے تعبیر کیا ہے۔''

(تدبر قرآن ۳/۱۶۰)

۲۰۱؎ یہ جواب اگرچہ لفظاً سخت نہیں ہے، لیکن معنی کے لحاظ سے دیکھا جائے تو نہایت سخت ہے۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''...مطلب یہ ہے کہ یہ منصب رسالت ایسی چیز نہیں ہے جس کا اہل ہر کس و ناکس بن جائے۔ یہ اللہ ہی خوب جانتا ہے کہ یہ تاج وہ کس کے سر پر رکھے۔ یہ مخمل اور زربفت کی جھول نہیں ہے جو بسا اوقات گدھوں پر بھی نظر آجاتی ہے، بلکہ یہ خلعت الٰہی اور تشریف آسمانی ہے جو اُنھی کو نصیب ہوتی ہے جن کا انتخاب اللہ تعالیٰ فرمائے۔''

(تدبر قرآن ۳/۱۶۰)

اِس سے مزید یہ معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ اِس منصب کے لیے منتخب بھی اُنھی کو فرماتا ہے جو استاذ امام کے الفاظ میں اپنی صلاحیتوں اور خوبیوں کے لحاظ سے نوع انسانی کے گل سرسبد، نخل فطرت کے بہترین ثمر اور کمال انسانیت کا مظہر اتم ہوتے ہیں۔

۲۰۲؎ یعنی اپنے اِس قانون کے مطابق کہ ہدایت وہی پائیں گے جو ہدایت کے سچے طالب ہوں گے اور جو ہدایت سے گریز و فرار کے راستے تلاش کرنے میں زندگی بسر کر دیں گے، وہ لازماً گمراہ کر دیے جائیں گے۔

عَلَى الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۲۵﴾ وَهٰذَا صِرَاطُ رَبِّكَ مُسْتَقِيْمًا قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ
لِقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ ﴿۱۲۶﴾ لَهُمْ دَارُ السَّلٰمِ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَهُوَ وَلِيُّهُمْ بِمَا كَانُوْا
يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۷﴾

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ قَدِ اسْتَكْثَرْتُمْ مِّنَ الْاِنْسِ وَقَالَ

---

آسمان میں چڑھنا پڑ رہا ہے۔ اللہ اِسی طرح اُن لوگوں پر ناپاکی مسلط کر دیتا ہے جو ایمان نہیں لاتے[۲۰۳]۔ (حقیقت یہ ہے کہ) یہ راستہ تیرے پروردگار کا سیدھا راستہ ہے[۲۰۴]۔ (اِس کی وضاحت میں) اپنی آیتیں ہم نے اُن لوگوں کے لیے تفصیل سے بیان کر دی ہیں جو یاددہانی حاصل کریں۔ اُن کے اعمال کے صلے میں اُن کے پروردگار کے ہاں اُن کے لیے سلامتی کا گھر ہے اور وہ اُن کا کارساز ہے[۲۰۵]۔ ۱۲۲-۱۲۷

اُس دن کو یاد رکھو، جب وہ اِن سب (مجرموں) کو اکٹھا کرے گا[۲۰۶]، (پھر فرمائے گا): اے جنوں

---

۲۰۳؎ مطلب یہ ہے کہ کفر و شرک کی نجاست کے جو ردے اِنھوں نے اپنے دل و دماغ میں جمار کھے ہیں، وہی اِن کے لیے قبول حق میں رکاوٹ بن گئے ہیں۔ چنانچہ اپنے مالوفات اور بدعات کو چھوڑنا اور اسلام کی سیدھی صاف راہ کو اختیار کرنا اِنھیں ایک کٹھن چڑھائی معلوم ہوتا ہے۔ اِس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اِنھیں توفیق ہدایت سے محروم کر دیا ہے۔ اُس کا قانون یہی ہے کہ اسلام کے لیے وہ اُنھی کا سینہ کھولتا ہے جو اِس طرح کی غلاظتوں سے اُسے پاک رکھتے اور حق کے سچے طالب بن کر زندگی بسر کرتے ہیں۔ اِس کے برخلاف جو تعصّبات کے اسیر ہو کر رہ جاتے ہیں، اُن کا سینہ وہ اپنی ہدایت کے لیے تنگ کر دیتا ہے۔ ہدایت و ضلالت کے باب میں یہ اُس کی سنت ہے اور وہ اپنی سنت میں کبھی تبدیلی نہیں کرتا۔

۲۰۴؎ اصل الفاظ ہیں: 'هٰذَا صِرَاطُ رَبِّكَ مُسْتَقِيْمًا'۔ اسم اشارہ میں چونکہ فعل کے معنی ہوتے ہیں، اِس وجہ سے 'مُسْتَقِيْمًا' یہاں 'صِرَاطُ رَبِّكَ' سے حال واقع ہو گیا ہے۔

۲۰۵؎ اوپر فرمایا تھا: 'سَيُصِيْبُ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا'۔ یہ جملہ اُس کے بالکل بالمقابل آیا ہے۔ یعنی مجرم جس انجام کو پہنچیں گے، اُس کے بالمقابل اللہ کے فرماں بردار بندوں کا صلہ یہ ہے کہ اللہ اُن کا ساتھی ہو گا اور وہ ہمیشہ کے لیے سکھ اور چین کے گھر میں رہیں گے۔

اَوْلِيٰٓؤُهُمْ مِّنَ الْاِنْسِ رَبَّنَا اسْتَمْتَعَ بَعْضُنَا بِبَعْضٍ وَّبَلَغْنَآ اَجَلَنَا الَّذِيْٓ اَجَّلْتَ لَنَا قَالَ النَّارُ مَثْوٰىكُمْ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۲۸﴾

کے گروہ، تم نے تو انسانوں میں سے بہتوں کو اپنا لیا[۲۰۷] اور انسانوں میں سے اُن کے ساتھی (فوراً) کہیں گے: پروردگار، ہم میں سے ہر ایک نے دوسرے سے خوب حظ اٹھایا[۲۰۸] اور (آج) اپنی اُس مدت کو پہنچ گئے ہیں جو تو نے ہمارے لیے مقرر کر دی تھی[۲۰۹]... اللہ فرمائے گا: تمھارا ٹھکانا اب دوزخ کی آگ ہے، تم اُس

۲۰۶؎ یعنی سب کو اکٹھا کرے گا، خواہ وہ انسانوں میں سے تھے یا جنوں کے اشرار و شیاطین میں سے جو انسانوں کو اپنی خرافات القا کرتے رہے، جیسا کہ اوپر آیت ۱۱۲ میں بیان ہوا ہے۔

۲۰۷؎ یہ ابلیس کے اُس قول کی طرف نہایت لطیف تلمیح ہے جس کا ذکر قرآن کے دوسرے مقامات میں ہوا ہے کہ آدم کی ذریت میں سے بہت تھوڑے میری تاخت سے محفوظ رہیں گے اور پروردگار، تو اِن میں سے اکثر کو اپنا شکر گزار نہ پائے گا۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...یعنی اللہ تعالیٰ ابلیس کے اِن فرزندان معنوی کو خطاب کر کے فرمائے گا کہ تم نے تو اپنے پیشوا ابلیس کا مشن بڑی کامیابی سے پورا کیا کہ ذریت آدم میں سے بہتوں کو اپنے فتراک ضلالت کا نخچیر بنا لیا اور بڑی سعادت مند نکلی یہ اولاد آدم کہ سادہ لوحی کے ساتھ تمھارے دام فریب میں پھنس گئی۔'' (تدبر قرآن ۳/ ۱۶۳)

۲۰۸؎ یعنی اُنھوں نے ہماری عبادت، نیاز مندی اور نذروں اور قربانیوں کے مزے لیے اور ہمارے ساحروں، کاہنوں اور سیانوں نے اپنے پیش نظر مقاصد کے لیے اُن کو طرح طرح سے استعمال کیا۔ چنانچہ جن و انس، دونوں ایک دوسرے سے حظ اٹھاتے رہے۔

۲۰۹؎ آگے کا جملہ بتا رہا ہے کہ شیاطین انس کی یہ بات بیچ ہی میں کاٹ دی جائے گی۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''یہاں بلاغت کلام کا ایک نکتہ قابل لحاظ ہے۔ شیاطین انس یہ بات بطور اعتراف جرم اور بقصد اظہار ندامت کہیں گے اور یہ تمہید باندھ کر وہ اللہ تعالیٰ سے معافی کی درخواست کرنا چاہیں گے، لیکن اسلوب کلام صاف شہادت دے رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ اُن کی بات تمہید پوری ہونے سے پہلے ہی کاٹ دے گا اور اُن کو معذرت اور درخواست معافی کا موقع دیے بغیر ہی اپنا فیصلہ سنا دے گا کہ 'اَلنَّارُ مَثْوٰىكُمْ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا' بس اب تمھارا ٹھکانا یہی دوزخ

وَكَذٰلِكَ نُوَلِّيْ بَعْضَ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضًاۢ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿١٢٩﴾ يٰمَعْشَرَ
الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ وَيُنْذِرُوْنَكُمْ
لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا قَالُوْا شَهِدْنَا عَلٰٓى اَنْفُسِنَا وَغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَشَهِدُوْا
عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ ﴿١٣٠﴾ ذٰلِكَ اَنْ لَّمْ يَكُنْ رَّبُّكَ مُهْلِكَ

---

میں ہمیشہ رہو گے، مگر جو اللہ چاہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تمھارا پروردگار حکیم و علیم ہے[210]۔ ہم ظالموں کو اُن کے کرتوتوں کے باعث اسی طرح ایک دوسرے پر مسلط کر دیتے ہیں۔ اے جنوں اور انسانوں کے گروہ، کیا تمھارے پاس خود تمھارے اندر سے وہ پیغمبر نہیں آئے تھے جو میری آیتیں تمھیں سناتے اور اِس دن کی ملاقات سے خبردار کرتے تھے[211]؟ وہ کہیں گے: ہم خود اپنے خلاف گواہ ہیں۔ (اِن پر افسوس)، دنیا کی زندگی نے اِنھیں دھوکے میں ڈالے رکھا اور اب خود اپنے خلاف گواہی دے رہے ہیں کہ وہ منکر

---

ہے جس میں تمھیں ہمیشہ رہنا ہے، اب باتیں بنانے کی کوشش نہ کرو، عذر، معافی، توبہ اور اصلاح، سب کے دروازے بند ہو چکے ہیں۔'' (تدبر قرآن ۳/ ۱۶۳)

۲۱۰؎ یہ استثنا قابل توجہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اِن مجرموں کے جہنم رسید ہو جانے کے بعد تمام معاملات صرف خدا کی مشیت پر منحصر ہوں گے اور اُس کی مشیت اُس کے علم و حکمت کے تحت ہے جس کا تقاضا ہوا تو وہ اُن کی سزا میں تخفیف بھی کر سکتا ہے اور اُنھیں خاک یا راکھ بنا کر ہمیشہ کے لیے اِسی جہنم کی مٹی میں دفن بھی کر سکتا ہے۔ یہ سراسر اُس کی مشیت پر مبنی ہے۔ اِس کے سوا کسی کے لیے امید کا کوئی دروازہ کھلا نہیں رہے گا۔ استاذ امام کے الفاظ میں کسی کی سعی، کسی کی سفارش، کسی کا زور، کسی کی فریاد کچھ کارگر نہ ہو گی، اختیار اور ارادے کی ساری حدیں ختم ہو جائیں گی، توبہ اور اصلاح اور حسرت و ندامت کی مہلتیں گزر جائیں گی، واحد چیز جو کارفرما ہو گی، وہ خدا کی مشیت ہے اور اپنی مشیت کے بھیدوں کو وہی جانتا ہے۔ وہ 'فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ' اور حکیم و علیم ہے۔

۲۱۱؎ یہ سوال قطع عذر کے لیے ہو گا۔ ضمناً یہ بات بھی اِس سے معلوم ہوئی کہ پیغمبر جس طرح انسانوں میں بھیجے گئے، اُسی طرح جنوں میں بھی اُن کے اندر سے بھیجے گئے۔ اِس کے لیے اصل میں 'اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ' کے الفاظ آئے ہیں۔ یہ اِس باب میں بالکل صریح ہیں اور یہی بات اُس قاعدے کے مطابق بھی ہے جو نبیوں کی بعثت

الْقُرٰی بِظُلْمٍ وَّاَھْلُھَا غٰفِلُوْنَ ﴿۱۳۱﴾ وَلِکُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا وَمَا رَبُّکَ
بِغَافِلٍ عَمَّا یَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳۲﴾ وَرَبُّکَ الْغَنِیُّ ذُو الرَّحْمَۃِ اِنْ یَّشَاْ یُذْھِبْکُمْ وَ
یَسْتَخْلِفْ مِنْ م بَعْدِکُمْ مَّا یَشَآءُ کَمَآ اَنْشَاَکُمْ مِّنْ ذُرِّیَّۃِ قَوْمٍ اٰخَرِیْنَ ﴿۱۳۳﴾

---

تھے۔(ہم نے) یہ (پیغمبر) اِسی لیے (بھیجے تھے) کہ تمھارا پروردگار بستیوں کو اُن کے ظلم کی پاداش میں ہلاک کرنے والا نہیں ہے، جبکہ اُن کے باشندے (حقیقت سے) بے خبر ہوں۔ (اِن میں سے) ہر ایک کا درجہ اب اُس کے عمل کے مطابق ہے اور جو کچھ یہ کرتے رہے ہیں، تمھارا پروردگار اُس سے ناواقف نہیں ہے۔ تمھارا پروردگار بے نیاز ہے، وہ رحمتوں والا ہے[۲۱۲]۔ اگر وہ چاہے تو تمھیں لے جائے

---

سے متعلق قرآن کے دوسرے مقامات میں بیان ہوا ہے کہ وہ جن کی طرف بھیجے جاتے ہیں، اُنھی کے اندر سے بھیجے جاتے ہیں۔

آیت میں لفظ 'یقصون' بھی قابل توجہ ہے۔ اِس کے معروف معنی سرگذشتیں سنانے کے ہیں، لیکن یہاں یہ آیتیں سنانے کے لیے آیا ہے۔ اِس کی وجہ کیا ہے؟ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ''...ہمارے نزدیک یہاں یہ لفظ اس وجہ سے استعمال ہوا ہے کہ آیات سے یہاں مراد آیات انذار ہیں جن کا غالب حصہ مکذبین ومنکرین کے انجام اور اُن کی سرگذشتوں کے بیان پر مشتمل ہوتا ہے۔ یہاں موقع ومحل اِسی کا ہے۔ اللہ تعالیٰ اُن سے جو سوال فرمائے گا، اُس کا مطلب یہی ہوگا کہ کیا تمھیں میرے رسولوں نے جھٹلانے والوں کے انجام اور اِس دن کی آمد سے خبردار نہیں کیا تھا کہ تم نے اپنے آپ کو اِس ابدی ہلاکت میں ڈالا؟''
>
> (تدبرقرآن ۳/۱۶۶)

۲۱۲ آگے جو بات فرمائی ہے، یہ جملہ اُس کی تمہید ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خدا ایک ہی وقت میں بے نیاز بھی ہے اور رحیم وکریم بھی۔ لوگوں کی ہدایت کا جو اہتمام اُس نے کیا ہے اور اپنے پیغمبر کے ذریعے سے ایمان واسلام کی دعوت اُنھیں دی ہے تو اِس لیے نہیں دی کہ اِس کے بغیر اُس کا کوئی کام رکا ہوا ہے۔ کسی کے ماننے سے نہ اُس کا کچھ بنتا ہے اور نہ انکار کر دینے سے کچھ بگڑتا ہے۔ وہ ہر چیز سے بے نیاز اور اپنی مخلوقات سے مستغنی ہے۔ اُس نے یہ اہتمام صرف اِس لیے کیا ہے کہ بے نیاز ہونے کے ساتھ وہ رحمت والا بھی ہے اور اُس کی اِس صفت کا تقاضا ہے کہ اتمام حجت کے بغیر کسی کو نہ پکڑے۔ چنانچہ وہ پوری مہلت دیتا، ہر لحاظ سے خبردار کرتا اور اُس کے بعد ہی لوگوں کی

اِنَّ مَاتُوۡعَدُوۡنَ لَاٰتٍ وَّمَآ اَنۡتُمۡ بِمُعۡجِزِیۡنَ ﴿۱۳۴﴾ قُلۡ یٰقَوۡمِ اعۡمَلُوۡا عَلٰی مَکَانَتِکُمۡ اِنِّیۡ عَامِلٌ فَسَوۡفَ تَعۡلَمُوۡنَ مَنۡ تَکُوۡنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ اِنَّهٗ لَا یُفۡلِحُ

اور تمھارے بعد تمھاری جگہ جس کو چاہے، لے آئے، جس طرح اُس نے دوسروں کی نسل سے تمھیں اٹھایا ہے۔[213] (یاد رکھو)، جس چیز کا وعدہ تم سے کیا جا رہا ہے، وہ آکر رہے گی[214] اور تم (خدا کو) عاجز نہیں کر سکتے۔ (اے پیغمبر)، کہہ دو کہ میری قوم کے لوگو، تم اپنے طریقے پر چلو، میں اپنے طریقے پر چل رہا ہوں۔[215]

گرفت کا فیصلہ سنا تا ہے۔

۲۱۳؎ مدعا یہ ہے کہ اپنی تاریخ سے سبق لو۔ خدا اگر تمھارے آبا کی نسل سے تمھیں پیدا کر سکتا ہے تو دوسروں کو تمھاری جگہ لے آنا بھی اُس کے لیے کچھ مشکل نہیں ہے۔ یہ صرف اُس کی رحمت ہے جو تمھیں باقی رکھے ہوئے ہے۔ وہ پکڑ بھی سکتا ہے اور تمھیں فنا کے گھاٹ بھی اتار سکتا ہے۔ اُسے یہ اندیشہ نہیں ہے کہ تم نہ رہے تو اُس کی دنیا بے آباد ہو جائے گی۔ وہ اپنی دنیا کے لیے جو مخلوق چاہے گا اور جب چاہے گا، پیدا کر لے گا۔

استاذ امام امین احسن اصلاحی نے آیت میں زبان کے ایک نکتے کی طرف بھی توجہ دلائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

’’...فرمایا کہ ’وَیَسۡتَخۡلِفۡ مِنۡ بَعۡدِکُمۡ مَّا یَشَآءُ‘، حالاں کہ بظاہر ’من یشاء‘ ہونا تھا، اِس لیے کہ ’مَا‘ کا غالب استعمال بے جان چیزوں ہی کے لیے ہے۔ میرے نزدیک ’مَنۡ‘ کی جگہ ’مَا‘ کا استعمال اللہ تعالیٰ نے اپنی کامل قدرت کے اظہار اور قریش کے غرور پر ضرب لگانے کے لیے فرمایا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم اپنی قوت وسطوت پر کیا اترا رہے ہو، خدا کی قدرت تو وہ ہے کہ وہ تمھارے اِس صحرا کی جس چیز کو چاہے، تمھاری جگہ لینے کے لیے اٹھا کھڑی کرے۔ سیدنا مسیح علیہ السلام نے بھی ایک جگہ بنی اسرائیل کو مخاطب کر کے فرمایا ہے کہ تم اِس بات پر گھمنڈ نہ کرو کہ تم ابراہیم علیہ السلام کی اولاد ہو، میرا خداوند چاہے تو ریگستان کے ذروں سے ابراہیم کے لیے اولاد کھڑی کرے۔ بعینہٖ یہی زور قرآن کے اِس اسلوب میں مضمر ہے، بلکہ قرآن کا اسلوب اپنی تعمیم کے پہلو سے زیادہ زوردار ہے۔‘‘ (تدبر قرآن ۳/ ۱۶۸)

۲۱۴؎ یعنی وہ عذاب بھی جو رسول کے مکذبین پر اِسی دنیا میں آتا ہے اور وہ یوم الحساب بھی جس کے بوجھ سے آسمان پھٹا پڑ رہا ہے اور جس کے لیے کسی وقت بھی صور پھونکا جا سکتا ہے۔

۲۱۵؎ آیت میں ایک مقابل حذف ہو گیا ہے، یعنی ’انی عامل علی مکانتی‘۔ لفظ ’مکانۃ‘ کے اصل معنی

الظّٰلِمُوْنَ ﴿١٣٥﴾

وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَ الْاَنْعَامِ نَصِيْبًا فَقَالُوْا هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ وَهٰذَا لِشُرَكَآئِنَا فَمَا كَانَ لِشُرَكَآئِهِمْ فَلَا يَصِلُ اِلَى اللّٰهِ وَمَا كَانَ لِلّٰهِ فَهُوَ يَصِلُ اِلٰى شُرَكَآئِهِمْ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ﴿١٣٦﴾ وَكَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ

---

عنقریب تم جان لو گے کہ انجام کار کی کامیابی[216] کسے حاصل ہوتی ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ ظالم کبھی فلاح نہیں پائیں گے۔[217] ۱۲۸-۱۳۵

(ان کا ظلم اِس حد کو پہنچ چکا ہے کہ) اللہ کے لیے اِنھوں نے خود اُسی کی پیدا کی ہوئی کھیتی اور چوپایوں میں سے ایک حصہ مقرر کیا ہے اور کہتے ہیں کہ یہ اللہ کا ہے، بزعم خود، اور یہ ہمارے ٹھیرائے ہوئے شریکوں کے لیے ہے۔ پھر جو اِن کے ٹھیرائے ہوئے شریکوں کے لیے ہے، وہ تو اللہ کو نہیں پہنچ سکتا اور

---

تو جگہ، منزلت اور مقام کے ہیں، لیکن طریقہ کا مفہوم چونکہ اِس کے لوازم میں سے ہے، اِس لیے موقع کلام کی رعایت سے اِس کے اندر آپ سے آپ پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ صاف صاف اعلان براءت اور نہایت واضح دھمکی ہے جو آگے کے جملوں سے بالکل نمایاں ہو جاتی ہے۔

۲۱۶؎ اصل میں لفظ 'عَاقِبَة' آیا ہے۔ اِس کے معروف معنی انجام کے ہیں، لیکن بعض اوقات یہ انجام خیر و فلاح کے معنی میں بھی آ جاتا ہے، اِس لیے کہ اصل انجام تو انجام فلاح و سعادت ہی ہوتا ہے۔

۲۱۷؎ یہ نہیں فرمایا کہ تم فلاح نہیں پاؤ گے یا ہم لازماً فلاح پائیں گے، بلکہ صرف یہ فرمایا ہے کہ ظالم کبھی فلاح نہیں پائیں گے۔ اِس اسلوب میں کیا بلاغت ہے؟ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''...یہ اسلوب بیان حکمت و دعوت کے نقطۂ نظر سے بھی نہایت موثر ہے اور یہ اُس خشیت و توکل پر بھی دلیل ہے جو انبیا و صالحین کے اندر ہوتی ہے۔ جو چیز پردۂ غیب میں ہے، جس کا فیصلہ ہونا ابھی باقی ہے، جس کی راہ میں ابھی معلوم نہیں کتنی دشوار گزار گھاٹیاں پار کرنی اور کتنی پرخطر وادیاں قطع کرنی ہیں، اُس کے باب میں جو بات کہی جا سکتی ہے، وہ اِسی حد تک کہی جا سکتی ہے۔ اِس سے آگے بڑھ کر کوئی دعویٰ کرنا بندگی اور خشیت الٰہی کے خلاف ہے۔''
> (تدبر قرآن ۳/ ۱۷۰)

قَتۡلَ اَوۡلَادِهِمۡ شُرَكَآؤُهُمۡ لِيُرۡدُوۡهُمۡ وَلِيَلۡبِسُوۡا عَلَيۡهِمۡ دِيۡنَهُمۡ وَلَوۡ شَآءَ اللّٰهُ
مَافَعَلُوۡهُ فَذَرۡهُمۡ وَمَا يَفۡتَرُوۡنَ ﴿۱۳۷﴾ وَقَالُوۡا هٰذِهٖۤ اَنۡعَامٌ وَّحَرۡثٌ حِجۡرٌ لَّا
يَطۡعَمُهَاۤ اِلَّا مَنۡ نَّشَآءُ بِزَعۡمِهِمۡ وَاَنۡعَامٌ حُرِّمَتۡ ظُهُوۡرُهَا وَاَنۡعَامٌ لَّا يَذۡكُرُوۡنَ
اسۡمَ اللّٰهِ عَلَيۡهَا افۡتِرَآءً عَلَيۡهِ سَيَجۡزِيۡهِمۡ بِمَا كَانُوۡا يَفۡتَرُوۡنَ ﴿۱۳۸﴾ وَقَالُوۡا مَا

---

جو اللہ کا ہے، وہ اِن کے شریکوں کو پہنچ سکتا ہے۔[۲۱۸] کیا ہی برے فیصلے ہیں جو یہ لوگ کرتے ہیں۔ اِسی طرح بہت سے مشرکوں کے لیے اُن کی اولاد کے قتل کو اُن کے ٹھیرائے ہوئے شریکوں نے خوش نما بنا دیا ہے،[۲۱۹] اِس لیے کہ اُن کو برباد کر ڈالیں اور اِس لیے کہ اُن کے دین کو مشتبہ بنا دیں۔[۲۲۰] اللہ چاہتا تو وہ ایسا نہ کر پاتے۔[۲۲۱] لہٰذا اُنھیں چھوڑو کہ اپنے اِسی افترا میں پڑے رہیں۔ کہتے ہیں کہ یہ چوپائے اور یہ کھیتی ممنوع ہیں، اِنھیں صرف وہی کھا سکتے ہیں جنھیں ہم کھلانا چاہیں، اپنے گمان کے مطابق۔ (اِسی طرح)

---

۲۱۸؎ اِس کی صورت یہ تھی کہ بتوں کے نام کی بکری مر جائے یا چوری ہو جائے یا اُن کے نام کا غلہ چوہے کھا جائیں یا اور کوئی حادثہ ہو جائے تو اُس کی تلافی لازماً خدا کے حصے میں سے کر دی جائے گی، لیکن اگر اِس طرح کی کوئی آفت خدا کے نام پر نکالے ہوئے حصے پر آ جائے تو اُس کی تلافی بتوں کے حصے میں سے نہیں ہو گی۔ گویا مرجع حق اُن کے نزدیک بتوں اور شریکوں ہی کا تھا اور کیوں نہ ہو، دنیا کے تمام مشرکین کی نقد ضروریات اُن کے ٹھیرائے ہوئے شریکوں سے وابستہ ہوتی ہیں۔ خدا سے اگر کچھ ملتا بھی ہے تو اُنھی کی وساطت سے ملتا ہے، بلکہ خدا نہ بھی دینا چاہے تو وہ دلوا کر چھوڑتے ہیں۔

۲۱۹؎ یہ سنگین جرم بعض مزعومہ جن بھوتوں کو راضی کرنے کے لیے کیا جاتا تھا۔ عرب جاہلیت میں اُن کے استھان بنے ہوئے تھے اور اُن کے پروہت، کاہن اور مجاور لوگوں کو اُن کی ناراضی کا خوف دلا کر اِس طرح کے جرائم اُن سے کراتے رہتے تھے۔

۲۲۰؎ یعنی اُس دین کو مشتبہ بنا دیں جو اُنھیں ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام کی وراثت میں ملا تھا۔

۲۲۱؎ لیکن اللہ نے نہیں چاہا، اِس لیے کہ اِس طرح کا جبر اُس اسکیم ہی کو باطل کر دیتا جو انسانوں کے امتحان کے لیے روبہ عمل ہے۔

فِیۡ بُطُوۡنِ ھٰذِہِ الۡاَنۡعَامِ خَالِصَۃٌ لِّذُکُوۡرِنَا وَمُحَرَّمٌ عَلٰۤی اَزۡوَاجِنَا وَاِنۡ یَّکُنۡ مَّیۡتَۃً فَھُمۡ فِیۡہِ شُرَکَآءُ سَیَجۡزِیۡھِمۡ وَصۡفَھُمۡ اِنَّہٗ حَکِیۡمٌ عَلِیۡمٌ ﴿۱۳۹﴾ قَدۡ خَسِرَ الَّذِیۡنَ قَتَلُوۡۤا اَوۡلَادَھُمۡ سَفَھًا بِغَیۡرِ عِلۡمٍ وَّحَرَّمُوۡا مَا رَزَقَھُمُ اللّٰہُ افۡتِرَآءً عَلَی اللّٰہِ قَدۡ ضَلُّوۡا وَمَا کَانُوۡا مُھۡتَدِیۡنَ ﴿۱۴۰﴾

کچھ جانور ہیں جن کی پیٹھیں (اُن کے نزدیک) حرام ہیں اور کچھ جانور ہیں جن پر محض اللہ پر جھوٹ باندھ کر اللہ کا نام نہیں لیتے۔ اللہ عنقریب اُن کو اِس جھوٹ کا بدلہ دے گا۔ اور کہتے ہیں کہ جو کچھ اِن جانوروں کے پیٹ میں ہے، وہ ہمارے مردوں کے لیے خاص ہے اور ہماری عورتوں کے لیے حرام ہے، لیکن اگر وہ مردہ ہو تو دونوں اُس (کے کھانے) میں شریک ہو سکتے ہیں۔ اللہ عنقریب اُن کی اِن باتوں کی سزا اُنھیں دے گا۔ بے شک، وہ حکیم و علیم ہے[۲۲۲]۔ یقیناً نامراد ہوئے وہ لوگ جنھوں نے اپنی اولاد کو محض بے وقوفی سے، بغیر کسی علم کے قتل کیا اور اللہ نے جو رزق اُنھیں عطا فرمایا تھا، اُسے اللہ پر جھوٹ باندھ کر حرام ٹھیرایا ہے[۲۲۳]۔ وہ یقیناً بھٹک گئے ہیں اور ہرگز راہ راست پر نہیں رہے۔ ۱۳۶-۱۴۰

۲۲۲؎ یعنی چونکہ حکیم و علیم ہے، اِس لیے یہ نہیں ہو سکتا کہ اُن لوگوں کو سزا نہ دے جو اُس کے نام پر اِس طرح کے جھوٹ گھڑتے ہیں۔

۲۲۳؎ یہ اِس لیے فرمایا ہے کہ اُن کے یہ خرافات اگرچہ مبنی تو تھے اُن کے مشرکانہ اوہام پر، لیکن اُنھیں منسوب بہرحال اللہ کی طرف کیا جاتا تھا۔

[باقی]

طالب محسن

# کلمۂ ایمان کے بعد قتل



عَنِ الْمِقْدَادِ بْنِ الْأَسْوَدِ أَنَّهُ أَخْبَرَهُ أَنَّهُ قَالَ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ أَرَأَيْتَ إِنْ لَقِيْتُ رَجُلًا مِّنَ الْكُفَّارِ فَقَاتَلَنِيْ فَضَرَبَ إِحْدٰى يَدَيَّ بِالسَّيْفِ فَقَطَعَهَا ثُمَّ لَاذَ مِنِّيْ بِشَجَرَةٍ فَقَالَ: أَسْلَمْتُ لِلّٰهِ، أَفَأَقْتُلُهُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ بَعْدَ أَنْ قَالَهَا؟ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: لَا تَقْتُلْهُ، قَالَ فَقُلْتُ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ، إِنَّهُ قَدْ قَطَعَ يَدِيْ ثُمَّ قَالَ ذٰلِكَ بَعْدَ أَنْ قَطَعَهَا أَفَأَقْتُلُهُ؟ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَقْتُلْهُ فَإِنْ قَتَلْتَهُ فَإِنَّهُ بِمَنْزِلَتِكَ قَبْلَ أَنْ تَقْتُلَهُ وَإِنَّكَ بِمَنْزِلَتِهِ قَبْلَ أَنْ يَّقُوْلَ كَلِمَتَهُ الَّتِيْ قَالَ.

---

حضرت مقداد بن اسود (رضی اللہ عنہ) بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے سوال کیا کہ آپ کی کیا راے ہے کہ اگر میرا کفار میں سے کسی آدمی کے ساتھ سامنا ہوا اور وہ میرے ساتھ قتال کرے اور پھر میرے ایک ہاتھ پر وار کرے اور اسے کاٹ ڈالے۔ پھر مجھ سے بچنے کے لیے درخت کے پیچھے پناہ لے اور پھر کہے کہ میں نے اللہ کے لیے اسلام قبول کیا تو کیا میں اسے قتل کر دوں جبکہ اس نے یہ کہا ہو؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اسے قتل نہ کرو۔ کہتے ہیں کہ میں نے پوچھا:

یارسول اللہ، اس نے میرا ہاتھ کاٹ ڈالا ہے پھر اس نے ہاتھ کاٹنے کے بعد یہ بات کہی ہے، تو کیا میں اسے قتل کر دوں؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم اسے قتل نہ کرو، کیونکہ تمھارے قتل کرنے سے پہلے وہ تمھاری ہی طرح ہے اور تم اس کی طرح ہو۔

وَأَمَّا مَعْمَرٌ فَفِی حَدِیْثِهِ: فَلَمَّا أَهْوَیْتُ لِأَقْتُلَهُ قَالَ: لَا إِلَهَ إِلَّا اللّٰهُ.

---

جہاں تک معمر کا تعلق ہے تو اس کی حدیث میں (میں نے اللہ کے لیے اسلام قبول کیا کے بجاے اس طرح) ہے: پھر جب میں اسے قتل کرنے کے لیے آگے بڑھا تو اس نے لا الٰہ الاّ اللہ کہہ دیا۔



## لغوی مباحث

أَسْلَمْتُ لِلّٰهِ: ویسے اس جملے کا مطلب ہے: میں اللہ کے آگے جھکا۔ لیکن یہاں دروبست سے واضح ہے کہ دین قبول کرنا مراد ہے۔ یہ جس قتال کی بات ہو رہی ہے، اس میں اہل کفر کے لیے جان کی امان کا ایک ہی رستہ تھا اور وہ یہ کہ وہ دین اسلام کو قبول کر لیں اور اللہ کی اطاعت کے دائرے میں آجائیں۔ یہ جملہ اسی فیصلے کو ظاہر کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسی روایت کے بعض متون میں اس کی جگہ کلمہ طیبہ بھی روایت ہوا ہے۔

## معنی

اس روایت کا تعلق بظاہر قرائن سورۂ توبہ کے حکم قتال کے بعد کے زمانے سے ہے۔ مراد یہ ہے کہ جب یہ حکم دے دیا گیا کہ جو اہل عرب ایمان نہیں لائے، انھیں قتل کر دو، الّا یہ کہ وہ ایمان لے آئیں تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص عین قتال کے موقع پر ایمان لانے کا اعلان کرے تو کیا کرنا چاہیے؟ یہاں سوال میں ہاتھ کاٹنے اور درخت کے پیچھے چھپنے کی بات شامل کر کے سوال کے اس پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے کہ یہ اعلان ایمان محض جان بچانے کے لیے ہے۔ شارحین یہ سوال زیر بحث لائے ہیں کہ اس سوال کے پیچھے کوئی حقیقی واقعہ ہے یا سوال میں واقعے کا بیان مثال کے طور پر ہے؟ ہمارے سامنے اس روایت کے جو متون ہیں، ان سب میں سوال کا اسلوب ایک ہی ہے اور اس سے یہی نمایاں ہوتا ہے کہ واقعہ محض تمثیلی ہے۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اس طرح کے واقعات اس زمانے

میں پیش آئے تھے۔لہٰذا یہ بالکل ممکن ہے کہ سوال میں اس طرح کے واقعات ہی ملحوظ ہوں۔

سوال کے جواب سے معلوم ہوتا ہے کہ اعلان ایمان کے حالات خواہ کچھ بھی ہوں، اس کا لحاظ کیا جائے گا۔کسی مسلمان کو اس بات کی اجازت نہیں دی گئی کہ وہ کسی مسلمان کو خواہ اس کے ایمان کے بارے میں اس کا اندازہ کچھ بھی ہو کہ وہ اسے قتل کر دے۔کلمۂ ایمان کے بعد قتل قتل ناحق ہے، الّا یہ کہ وہ شخص کسی ایسے جرم کا مرتکب ہو جس کے نتیجے میں مباح الدم ہو جائے۔یہی بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ایک اور ارشاد میں 'الا بالحق'[1] کے الفاظ میں بیان کی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس دنیا میں معاملہ ظاہر پر رکھا گیا ہے۔کسی انسان کو یہ قدرت حاصل نہیں کہ وہ دل کی حقیقت تک رسائی حاصل کر سکے۔جس طرح یہ ممکن ہے کہ کوئی شخص دل سے ایمان نہ لائے۔اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ انتہائی صورت حال کسی کے لیے انکشاف حقیقت کا سبب بن جائے اور وہ دل سے ایمان لے آئے۔نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو دعوت برپا کی تھی، وہ عین انسانی فطرت کا بیان تھی، اس لیے ہر عرب ضمیر کی کشمکش کے ساتھ کفر کی حالت میں تھا۔نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا غلبہ عربوں کی اکثریت کے لیے اس کشمکش سے نکل کر حق کو قبول کرنے کا سبب بن رہا تھا۔چنانچہ کسی کے لیے آخری رکاوٹ کب دور ہوتی ہے؟ اس کو خارج سے طے نہیں کیا جا سکتا۔یہی وجہ ہے کہ دوٹوک الفاظ میں کہا گیا کہ کلمۂ ایمان کے بعد قتل نہیں کیا جا سکتا۔

اس روایت سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ دنیا میں ظاہر پر اعتبار ہے۔جس شخص نے ایمان کا اعلان کر دیا، وہ مسلمان ہی سمجھا جائے گا۔اس طرح کے نازک موقعے پر بھی محض شبہے میں کسی کو کافر سمجھنے یا کافر قرار دینے کی اجازت نہیں دی گئی۔قرآن مجید میں بھی یہی حکم دیا گیا ہے۔سورۂ نساء میں ہے:

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا ضَرَبْتُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَتَبَیَّنُوْا وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰٓی اِلَیْکُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا تَبْتَغُوْنَ عَرَضَ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا فَعِنْدَ اللّٰہِ مَغَانِمُ کَثِیْرَۃٌ کَذٰلِکَ کُنْتُمْ مِّنْ قَبْلُ فَمَنَّ اللّٰہُ عَلَیْکُمْ فَتَبَیَّنُوْا اِنَّ اللّٰہَ کَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرًا. (۴:۹۴)

''اے ایمان والو، جب تم خدا کی راہ میں نکلو تو معاملہ واضح کر لیا کرو۔وہ شخص جو تمھیں السلام علیکم کہے، اسے دنیا حاصل کرنے کی غرض سے یہ نہ کہو کہ تم مومن نہیں ہو، کیونکہ اللہ کے پاس بہت ساری غنیمتیں ہیں۔اس سے پہلے تم بھی انھی کی طرح تھے۔پھر اللہ نے تم پر (اپنا) فضل کیا۔تم پر واضح رہے کہ تم جو کچھ کرتے ہو، اللہ اس سے پوری طرح واقف ہے۔''

---

[1] ''مگر یہ کہ کوئی حق قائم ہو جائے۔''

اس روایت کی اصل مشکل اس کا آخری حصہ ہے۔ حضور نے مقتول اور سائل کو کس پہلو سے مشابہ قرار دیا ہے۔ شارحین نے اس سوال کے تین جواب دیے ہیں:

ایک یہ کہ اس کی جان بھی محفوظ اور مامون تھی جس طرح تمھاری جان محفوظ و مامون ہے۔

دوسرا یہ کہ جس طرح تم پہلے غیر مسلم تھے اور بعد میں تمھیں ایمان کی توفیق ملی، اسی طرح وہ بھی غیر مسلم سے مسلمان ہوا تھا۔

تیسرا یہ کہ وہ بھی تمھاری طرح ایمان چھپائے ہوئے تھا اور اس نے ایک موقع پر آ کر ایمان ظاہر کیا تھا۔ اس معنی کی تائید ان روایتوں سے پیش کی گئی ہے جن میں حضرت مقداد کے اپنا ایمان ظاہر نہ کرنے کا ذکر ہوا ہے۔

سب شارحین اس بات پر متفق ہیں کہ اس جملے سے کفر میں مشابہت مراد نہیں ہے اور اس طرح وہ اس روایت سے ارتکاب کبیرہ پر تکفیر کے معنی نکالنے کی تردید کرتے ہیں۔ لیکن بعض شارحین نے یہ نکتہ بیان کیا ہے کہ ناحق قتل کی وجہ سے انجام کی وعید میں برابری مراد ہے۔ اور کچھ نے یہ نکتہ نکالا ہے کہ اس میں اس خون کے ہدر ہونے کا بیان ہے۔ مراد یہ ہے کہ اس پر کوئی قصاص نہیں ہوگا۔

ہمارے نزدیک اس روایت میں وہی بات بیان ہوئی ہے جو قرآن مجید کی محولہ بالا آیت میں بیان ہوئی ہے۔ مراد یہ ہے کہ جس طرح تم کفر کی حالت سے نکلے ہو اور تمھیں ہدایت کی نعمت حاصل ہوئی ہے، اسی طرح کا معاملہ تمام اہل عرب کا ہے۔ جس طرح تم ایمان لانے کے باعث خدا کی گرفت سے مصئون و مامون ہوئے ہو، اسی طرح ہر ایمان لانے والا کافر مامون ہو جائے گا۔ جس طرح تمھارے ایمان لانے کی قدر شناسی کی گئی ہے، اسی طرح تم بھی ایمان لانے والوں کے ایمان کی قدر کرو۔

## متون

یہ روایت ان روایتوں میں سے ہے جن کا متن بہت پہلے ضبط تحریر میں آ گیا تھا۔ امام شافعی نے اپنی کتاب ''الام'' میں اسے روایت کیا ہے اور بعد کی کتابوں میں بہت معمولی فرق کے ساتھ انھی الفاظ اور اسی ترتیب بیان کے ساتھ روایت کتب حدیث میں مرقوم ہے۔ جیسے ایک روایت میں 'الکفار' کی جگہ 'المشرکین' کا لفظ آیا ہے یا قتل کے لیے کسی میں باب مفاعلہ کا صیغہ ہے اور کسی میں باب افتعال کا۔ چنانچہ اس روایت کے بارے میں اگر یہ کہا جائے کہ اس کے متون میں اختلاف نہیں ہے تو یہ بات بڑی حد تک درست ہے۔

ایک فرق معنی کی بحث میں بیان ہوگیا ہے کہ 'أَسْلَمْتُ لِلّٰهِ' کے بجاے 'لا الٰه الّا اللّٰه' کہنے کا بھی ذکر ہے۔ اسی طرح بعض روایتوں میں یہ تصریح بھی نقل ہوئی ہے کہ اس آدمی کے ساتھ مڈبھیڑ میں کچھ دیر مقابلہ ہوا اور جب یہ اس پر غالب آ گئے تو اس نے ایمان کا کلمہ کہا۔ البتہ صاحب ''المعجم الکبیر'' نے ایک ایسی روایت بھی شامل کتاب کی ہے جس میں مکالمے کے جملے کافی تفصیلی ہیں:

إِنْ لَقِيتُ رَجُلًا مِّنَ الْكُفَّارِ فَاخْتَلَفْتُ أَنَا وَهُوَ ضَرْبَتَيْنِ فَضَرَبَنِيْ فَأَبَانَ إِحْدٰى يَدَيَّ فَضَرَبْتُهُ ثُمَّ قَدَرْتُ عَلٰى قَتْلِهِ فَقَالَ حِيْنَ أَرَدْتُ أَنْ أَهْوِيَ إِلَيْهِ بِسِلَاحِيْ: لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، أَقْتُلُهُ أَمْ أَتْرُكُهُ؟ قَالَ: لا بَلِ اتْرُكْهُ فَقُلْتَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ، وَإِنْ قَطَعَ إِحْدٰى يَدَيَّ؟ قَالَ: وَإِنْ فَعَلَ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ، وَإِنْ قَطَعَ إِحْدٰى يَدَيَّ؟ قَالَ: وَإِنْ فَعَلَ فَرَاجَعْتُهُ فَقَالَ: إِنْ قَتَلْتَهُ بَعْدَ أَنْ يَّقُوْلَ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ فَأَنْتَ بِمَنْزِلَتِهِ قَبْلَ أَنْ يَّقُوْلَهَا وَهُوَ بِمَنْزِلَتِكَ قَبْلَ أَنْ تَقْتُلَهُ.

(رقم ۵۹۰)

''اگر میری کفار کے ایک آدمی سے مڈبھیڑ ہو۔ میرے اور اس کے مابین دو ایک واروں کا تبادلہ ہو۔ پھر اس نے میرے ایک ہاتھ پر وار کیا اور میں نے اس پر وار کیا۔ پھر میں نے اس پر قابو پا لیا کہ اسے قتل کر سکوں، جب میں اپنے ہتھیار کے ساتھ اسے قتل کرنے کے لیا بڑھا تو اس نے کلمہ پڑھ لیا۔ کیا میں اسے قتل کروں یا چھوڑ دوں؟ آپ نے فرمایا: نہیں، بلکہ اسے چھوڑ دو۔ میں نے پوچھا: یا رسول اللہ اگرچہ اس نے میرا ہاتھ کاٹ ڈالا ہو؟ آپ نے فرمایا: اگرچہ اس نے یہ کیا ہو۔ میں نے پھر پوچھا: یا رسول اللہ اگرچہ اس نے میرا ہاتھ کاٹ ڈالا ہو؟ آپ نے فرمایا: اگرچہ اس نے یہ کیا ہو۔ میں نے پھر دہرایا تو آپ نے فرمایا: اگر تم نے اسے قتل کیا تو تم اس کی جگہ پر ہو اس کے یہ کلمہ پڑھنے سے پہلے اور وہ تمھاری جگہ پر ہے تمھارے قتل کرنے سے پہلے۔''

علاوہ ازیں بعض راویوں نے حضرت مقداد رضی اللہ عنہ کا تعارف بھی کرایا ہے کہ یہ بنو زہرہ کے حلیف تھے اور انھوں نے جنگ بدر میں شرکت کی تھی۔

کتب حدیث میں اس واقعے کی طرح کے واقعات بعض دوسرے لوگوں نے بھی بیان کیے ہیں۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس زمانے کا ایک حقیقی اور عملی مسئلہ ہے جو اس روایت میں زیر بحث آیا ہے۔

## کتابیات

مسلم، رقم ۹۵-۹۷۔ بخاری، رقم ۳۷۹۴۔ احمد، رقم ۲۳۸۶۸، ۲۳۸۸۲۔ مسند الشافعی بحوالہ کتاب الام ومن کتاب جراح العمد ۔مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۴۸۶، ۲۸۹۴۳، ۳۳۱۰۷۔ ابی داؤد، رقم ۲۶۴۴۔ نسائی، رقم ۸۵۹۱۔ ابن حبان، رقم ۱۶۴۔ المعجم الکبیر، رقم ۵۸۵-۵۹۵۔ بیہقی، رقم ۱۵۶۲۴، ۱۶۶۰۰۔ معرفۃ السنن والآثار، رقم ۴۷۹۰، ۵۰۲۵۔ المسند المستخرج علی الصحیحین، رقم ۲۷۲-۲۷۳۔

محمد وسیم اختر مفتی

# سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ

[''سیر وسوانح'' کے زیر عنوان شائع ہونے والے مضامین ان کے فاضل مصنفین کی اپنی تحقیق پر مبنی ہوتے ہیں، ان سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔'']

(۳)

(گذشتہ سے پیوستہ)



آخر کار حضرت علی کی بیعت ہوئی، سب سے پہلے اشتر نخعی نے ان کا ہاتھ تھاما تاہم، حضرت سعد نے ان کی بیعت نہ کی۔ بیعت نہ کرنے والے دوسرے صحابہ عبداللہ بن عمر، صہیب رومی، زید بن ثابت، محمد بن مسلمہ، سلمہ بن وقش اور اسامہ بن زید تھے۔ حضرت سعد کے بھتیجے ہاشم بن عتبہ نے انھیں حصول خلافت پر آمادہ کرنے کی کوشش کی لیکن ان کے صریح انکار پر وہ حضرت علی کی حمایت کرنے لگے۔

حضرت سعد بن ابی وقاص میں گوشہ نشینی کا رجحان تھا، فرماتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عثمان بن مظعون کو عورتوں سے منقطع ہونے سے روک دیا تھا۔ اگر آپ نے انھیں اجازت دی ہوتی تو ہم بھی خصی ہو جاتے۔ خصی ہونا اب مطلقاً حرام ہے۔ زمانۂ فتنہ میں جب مسلمانوں میں باہم جنگ و جدال ہوا، ان میں یہ رجحان عود کر آیا اور وہ ابوذر، سعید بن زید اور سلمہ بن اکوع کی طرح کنارہ کر گئے۔ حضرت سعد نے نماز کے لیے مسجد نبوی میں آنا بھی چھوڑ دیا جہاں ادا کی ہوئی نماز ایک ہزار نمازوں کا ثواب رکھتی ہے اور ذوالحلیفہ جانے والے راستے پر مدینہ سے ۸ میل دور حمراء الاسد میں واقع اپنے گھر سے چپک گئے۔ انھوں نے اہل خانہ سے کہا، لوگوں کے حالات انھیں نہ

بتائے جائیں حتیٰ کہ امت ایک امام پر جمع ہو جائے۔اسی مزاج کا نتیجہ تھا کہ حضرت سعد نزاعی اور گروہی سیاست سے دور رہے۔حضرت عثمان کی شہادت کے بعد متحارب مسلمانوں کے درمیان ہونے والی دوسری جنگ، جنگ صِفّین بھی کسی نتیجہ کے بغیر ختم ہوگئی تو فریقین میں مصالحت کی کوششیں شروع ہوئیں۔حضرت علی کی جانب سے ابوموسیٰ اشعری اور حضرت معاویہ کی طرف سے عمرو بن عاص کو حکم بنایا گیا۔ رمضان ۳۷ھ میں ان دونوں کی ملاقات طے تھی۔ حضرت علی نے ابوموسیٰ اشعری اور عبداللہ بن عباس کے ساتھ شریح بن ہانی کی قیادت میں ۴۰۰ سواروں کا ایک دستہ بھیجا۔حضرت معاویہ نے بھی عمرو بن عاص کے ساتھ ۴۰۰ سوار بھیجے۔ یہ کوفہ وشام کے بیچ واقع مقام دومۃ الجندل پہنچے۔صحابہ وتابعین میں سے عبداللہ بن عمر، عبدالرحمان بن ابوبکر، عبداللہ بن زبیر، مغیرہ بن شعبہ، عبدالرحمان بن حارث، عبدالرحمان بن عبد یغوث اور ابوجہم بن حذیفہ بھی وہاں موجود تھے۔ یہ کوشش بھی بے ثمر ثابت ہوئی۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے، اس موقع پر حضرت سعد بن ابی وقاص بھی آئے اور کم زور موقف اپنانے پر ابوموسیٰ کو ڈانٹا تاہم درست بات یہی ہے کہ وہ مدینہ سے باہر بنوسلیم کے چشمے پر اپنے اونٹوں کے باڑے میں تھے۔ان کے بیٹے عمر انھیں لینے پہنچے، حضرت سعد نے انھیں دیکھ کر کہا، میں آنے والے سوار کے شر سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں۔عمر نے اصرار کیا، ابا جان! لوگ اقتدار کی جنگ میں مشغول ہیں اور آپ اپنے اونٹوں اور اپنی بھیڑ بکریوں میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ دونوں اطراف کے ثالث اور قریش کے اہم افراد جمع ہیں۔آپ بھی چلیں کیونکہ کہ اس وقت غیر متنازع صحابئ رسولؐ ہونے کی وجہ سے آپ خلافت کے سب سے زیادہ حق دار ہیں۔حضرت سعد نے ان کے سینے پر ہاتھ مار کر کہا، خاموش ہو جا! اللہ اس بندے کو پسند کرتا ہے جو پرہیز گار، بے نیاز ہو اور بچ بچا کر رہے۔یہی سوچ حضرت سعد پر غالب رہی، انھوں نے مشورہ چاہنے والے حسین بن خارجہ کو بھی ایسا سجھاؤ دیا: بکریوں کا ریوڑ لے کر اسے چرانے میں میں مشغول ہو جاؤ حتیٰ کہ معاملات واضح ہو جائیں۔ان کے برعکس ان کا بیٹا عمر (ابن سعد) امارت کا فریفتہ رہا حتیٰ کہ اس فوج کا کمانڈر بن گیا جس نے حضرت حسین کو شہید کیا۔

حضرت سعد سے پوچھا جاتا، (علی وعائشہ کے مابین) جنگ میں آپ کے شامل ہونے میں کیا رکاوٹ ہے؟ تو کہتے مجھے ایسی تلوار لا دو جو کافر و مومن میں تمیز کر سکے۔ان کے بھتیجے ہاشم بن عتبہ نے کہا، چچا! یہاں ایک لاکھ تلواریں (یعنی افراد) موجود ہیں جو آپ کو خلافت کا سب سے زیادہ حق دار سمجھتی ہیں۔حضرت سعد نے جواب دیا، مجھے لاکھوں کے بجائے ایک ہی تلوار درکار ہے جس سے میں کسی مومن پر وار کروں تو ایذا پہنچائے نہ کاٹ کرے اور جب کافر پر آزماؤں تو خوب چلے۔حضرت معاویہ نے ان سے شکوہ کیا، تم علی کو برا بھلا کیوں نہیں کہتے تو انھوں نے

جواب دیا، میں اس شخص سے کیسے قتال کر سکتا تھا جسے خطاب کرتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،''کیا پسند نہیں کرتا کہ میرے لیے ایسا ہو جائے جیسے ہارونؑ موسیٰؑ کے لیے تھے۔ ہاں اتنا ہے کہ میرے بعد کوئی نبی نہ ہو گا۔'' معاویہ نے پوچھا، تم نے یہ فرمان کس سے سنا ہے؟ انھوں نے کہا، فلاں فلاں سے اور ام المومنین ام سلمہ سے۔ معاویہ نے کہا، اگر میں نے یہ ارشاد سنا ہوتا تو علی سے ہرگز قتال نہ کرتا۔ حضرت سعد نے مزید کہا، یہ علی ہی تھے جن کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ خیبر کے موقع پر فرمایا تھا، کل میں پرچم اس شخص کے ہاتھ میں دوں گا جسے اللہ اور اس کا رسولؐ پسند کرتے ہیں۔ معاویہ نے حضرت سعد بن ابی وقاص، عبداللہ بن عمر اور محمد بن مسلمہ کو خط بھیجے کہ خلیفۂ سوم عثمان کا خون بہا لینے میں ان کی مدد کریں۔ انھوں نے خیال ظاہر کیا کہ وہ حضرت عثمان کا ساتھ چھوڑ دینے کا کفارہ اسی طرح ادا کر سکیں گے۔ ان تینوں نے انکار کر دیا۔

سیدنا علی کی شہادت کے بعد اقتدار معاویہ کو منتقل ہوا تو حضرت سعد ان سے ملنے آئے اور کہا، بادشاہ سلامت! السلام علیک۔ معاویہ نے مسکرا کر کہا، ابواسحاق! کیا حرج تھا، اگر آپ امیر المومنین کہہ دیتے؟ حضرت سعد نے کہا، آپ مسکرا کر یہ بات کر رہے ہیں؟ بخدا! میں ہرگز پسند نہ کروں گا کہ اس منصب کی ذمہ داری اٹھاؤں جس پر آپ فائز ہو گئے ہیں۔ حضرت سعد نے ماہ رمضان معاویہ کے ہاں گزارا۔ اس دوران میں انھوں نے نماز قصر سے ادا کی اور روزہ نہ رکھا۔ ایک روایت کے مطابق انھوں نے معاویہ کی بیعت بھی کی۔

ایک بار حضرت سعد بن ابی وقاص، خالد بن ولید اور کچھ دوسرے صحابہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر آئے۔ ام المومنین میمونہ نے کہیں سے آیا ہوا بھنا ہوا گوشت پیش کیا۔ آپؐ نے کھانے کے لیے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ وہ پکاریں، رسول اللہؐ کو بتا دو، یہ گوہ کا گوشت ہے۔ آپؐ نے ہاتھ کھینچ لیا تو صحابہ نے بھی کھانا چھوڑ دیا۔ خالد بن ولید نے پوچھا، یارسول اللہ! کیا یہ حرام ہے؟ آپؐ نے فرمایا، کھاؤ، یہ حلال ہے۔ (میں اس لیے نہیں کھاتا کیونکہ) یہ میری قوم (قریش) کی سرزمین (مکہ) میں نہیں ہوتی اور ہماری خوراک میں شامل نہیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام ابورافع حضرت سعد کے پڑوسی تھے۔ انھوں نے حضرت سعد سے کہا، میرے گھر کے دونوں کمرے خرید لو۔ حضرت سعد نے کہا، میں ۴ ہزار درہم سے زیادہ نہیں دے سکتا، وہ بھی قسطوں میں دوں گا۔ ابورافع نے کہا، مجھے اس کے ۵ سو دینار مل رہے ہیں۔ اگر میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ''پڑوسی اپنے قرب کی وجہ سے زیادہ حق دار ہے۔'' نہ سنا ہوتا تو ۴ ہزار دینار میں ہرگز نہ دیتا۔ اسی روایت سے احناف نے حق شفعہ کا مسئلہ اخذ کیا ہے۔ حضرت سعد وتر ایک رکعت پڑھتے تھے۔ عہد فاروقی میں جب حضرت سعد بن ابی وقاص کوفہ کے گورنر تھے، عبداللہ بن عمران سے ملنے

گئے۔انھوں نے موزوں پر مسح کرتے دیکھ کر اعتراض کیا تو حضرت سعد نے روایت بیان کی کہ نبئ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسح علی الخفینکیا ہے۔عبداللہ نے اپنے والد عمر سے حضرت سعد کی اس روایت کی تصدیق چاہی تو انھوں نے کہا، جب سعد تم سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی روایت بیان کریں تو کسی اور سے ہرگز نہ پوچھنا۔اس درجہ ثقاہت رکھنے کے باوجود حضرت سعد حدیث بیان کرنے سے کتراتے تھے، کہتے تھے، مجھے اندیشہ ہے، ایک حدیث میں بیان کروں گا اور سو تم بنا لو گے۔سائب بن یزید کہتے ہیں ، میں طلحہ بن عبیداللہ ،سعد، مقداد اور عبدالرحمان بن عوف کی صحبت میں رہا اور کبھی انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث بیان کرتے نہیں سنا۔ہاں طلحہ سے میں نے جنگ احد کے حالات سنے تھے۔

صحیح بخاری میں حضرت سعد سے مروی احادیث کی تعداد ۵ ہے جب کہ صحیح مسلم میں ۱۱۸ احادیث ان سے روایت کی گئی ہیں۔حضرت سعد بن ابی وقاص نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خولہ بنت حکیم سے حدیث روایت کی۔ان سے روایت کرنے والوں کے نام یہ ہیں، عائشہ ام المومنین،عبداللہ بن عباس،عبداللہ بن عمر، جابر بن سمرہ، احنف بن قیس،سعید بن مسیّب،عروہ بن زبیر،شریح بن ہانی، ابوصالح ذکوان ،مجاہد، ابوعثمان نہدی،قیس بن ابو حازم، ابراہیم بن سعد، عامر بن سعد، عمر بن سعد، محمد بن سعد، مصعب بن سعد، عائشہ بنت سعد، ابراہیم بن عبدالرحمان، ایمن حبشی ،بسر (بشر) بن سعید، حارث بن مالک ، حسین بن عبدالرحمان، راشد بن سعد، زیاد بن جبیر، ابوعیاش، سائب بن یزید، سلیمان بن ابوعبداللہ، شریح بن عبید، عبداللہ بن ثعلبہ، عبدالرحمان بن سائب، عبیداللہ بن ابونہیک ،علقمہ بن قیس ،عمرو بن میمون، غنیم بن قیس، قاسم بن ربیعہ، ابوبکر بن خالد، مالک بن اوس، مجاہد بن جبیر اور موسیٰ بن طلحہ۔

۵۰ ھ میں حضرت حسن کو زہر دیا گیا، حضرت حسین حجرۂ عائشہ میں ان کی تدفین کرنا چاہتے تھے۔عائشہ نے اجازت بھی دے دی لیکن بنو امیہ نے شور مچایا، عثمان کو تو بقیع میں دفنایا گیا اور حسن کو آنحضرتؐ کے پہلو میں جگہ دے دی جائے۔فتنہ بڑھنے کا اندیشہ تھا اس لیے حضرت سعد، ابوہریرہ، جابر اور عبداللہ بن عمر نے مشورہ دیا کہ اس بات پر تلوار زنی اور خون ریزی نہ کی جائے۔ ارقم بن ابی ارقم کی نماز جنازہ حضرت سعد نے پڑھائی۔انھوں نے سعید بن زید کو غسل دیا۔

حضرت سعد کے بیٹے عامر سے رسول اکرمؐ کے اس قول کے بارے میں پوچھا گیا جو آپؐ نے حضرت سعد کے بارے میں فرمایا تھا، ''تم زندہ رہے تو توقع ہے کہ کئی قومیں تم سے فائدہ اٹھائیں گی اور کچھ کو تم سے ضرر پہنچے گا'' انھوں نے جواب دیا، حضرت سعد عراق کے گورنر بنائے گئے تو انھوں نے مرتدین کی ایک قوم کو قتل کیا۔یہ ان کا ضرر ہوا اور

انھوں نے بے شمار لوگوں کو مسیلمہ کذاب کی پیروی سے رجوع کرنے کی دعوت دی۔ انھوں نے توبہ کی اور حضرت سعد کی نصیحت سے نفع اٹھایا۔ ابوامامہ باہلی بیان کرتے ہیں، ایک مجلس میں ہم رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے تھے کہ ذکر آخرت سے ہم پر رقت طاری ہو گئی۔ حضرت سعد بن ابی وقاص دھاڑیں مار کر رونے لگے اور روتے روتے کہا، کاش! میں مر گیا ہوتا۔ آپ ؐ نے انھیں ڈانٹا اور کہا، سعد! تو میرے پاس بیٹھ کر موت کی تمنا کر رہا ہے؟ پھر فرمایا، اگر تو جنت کی مخلوق ہے تو تیری عمر جتنی لمبی ہو گی یا تیرے اعمال جتنے اچھے ہوں گے تمھارے لیے اتنا ہی بہتر ہو گا۔

حضرت سعد خود بیان کرتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے لیے دعا فرمائی، ''اے اللہ! سعد کی دعا قبول کرنا جب تجھے پکارے۔'' دوسری روایت یوں ہے، اللہ! ''سعد کے تیر کو سیدھا نشانے پر لگنے والا بنا دے اور اس کی دعا قبول کر۔'' اسے اپنے بندوں کا محبوب بنا دے۔ ایک بار آپ ؐ نے فرمایا، اللہ بندے کی دعا قبول نہیں کرتا حتی کہ اس کی خوراک پاک صاف نہ ہو۔ حضرت سعد بن ابی وقاص نے کہا، یارسول اللہ! دعا کیجیے کہ میرا کھانا پاک ہو جائے۔ آپ ؐ نے دعا فرمائی تو حضرت سعد خوش بو بوٹی سنبلہ سے بھی بچنے لگے جو ان کے کھیت میں ادھر ادھر سے آ جاتی اور اسے اس کے مالک پاس لوٹا کر آتے۔ ایک شخص نے حضرت علی کو گالیاں دیں تو حضرت سعد نے اسے روکا، وہ منع نہ ہوا تو اسے بد دعا دی۔ ایک اور شخص علی، طلحہ اور زبیر کو سب وشتم کر رہا تھا۔ حضرت سعد بن ابی وقاص نے اسے منع کیا۔ وہ باز نہ آیا تو دوگانہ ادا کر کے دعا کی، اے اللہ! اس نے ان بندوں کو گالیاں دی ہیں جو نیکیاں کر کے تیرے پاس آ چکے ہیں، اسے دوسروں کے لیے عبرت اور مثال بنا دے۔ عامر بن حضرت سعد روایت کرتے ہیں، ایک بختی اونٹنی بھاگتی ہوئی آئی اور اسے کچل دیا۔ ایک دن ایک غلام حضرت سعد بن ابی وقاص کے پاس دوڑتا ہوا آیا، اس کی ایڑیاں خون سے تر تھیں۔ حضرت سعد نے پوچھا، تمھیں کس نے زخمی کیا؟ اس نے بتایا، آپ کے بیٹے عمر نے۔ انھوں نے بد دعا دی، اللہ! اسے مار ڈال اور اس کی خون ریزی کر۔ حضرت سعد کی بد دعا قبول ہوئی، عمر کو حاکم کوفہ مختار نے مروا دیا کیونکہ وہ سیدنا حسین کے قاتلوں میں شامل تھا۔



حضرت سعد بن ابی وقاص اپنے بیٹوں کو وہ دعائیہ کلمات سکھاتے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز کے بعد پڑھتے تھے، کہتے، آپ ؐ نے ہمیں بھی ان کی تعلیم دی۔ اے اللہ! میں تیری پناہ مانگتا ہوں بخل سے، تیری پناہ میں آتا ہوں بزدلی سے، پناہ مانگتا ہوں کہ مجھے پست ترین عمر میں ڈال دیا جائے، میں پناہ مانگتا ہوں دنیا کے فتنے یعنی فتنۂ دجال سے اور پناہ چاہتا ہوں قبر کے عذاب سے۔ بیٹا اگر مال کی طلب ہو تو بھی قناعت سے کام لینا اس لیے کہ

قناعت سے محروم انسان کو مال بھی فائدہ نہیں دیتا۔

حضرت سعد بن ابی وقاص ۵۵ھ (یا ۵۱ھ یا ۵۶ھ) میں مدینہ سے ۱۰ میل دور واقع وادی عقیق میں فوت ہوئے۔ ان کی عمر ۷۴ (یا ۸۳) برس ہوئی، عشرۂ مبشرہ، سابقون الاولون اور مہاجرین میں سے وہ سب سے آخر میں فوت ہوئے۔ مصعب بن سعد کہتے ہیں، میرے والد فوت ہوئے تو ان کا سر میری گود میں تھا۔ میں رونے لگا تو کہا، اللہ مجھے ہرگز عذاب نہ دے گا۔ تم بھی خالص اللہ کے لیے عمل کرو۔ حضرت سعد نے وصیت کی، انھیں اسی پھٹے پرانے جبے کا کفن دیا جائے جسے جنگ بدر میں پہن کر انھوں نے مشرکین کا مقابلہ کیا تھا۔ اسے انھوں نے اسی مقصد کے لیے چھپا رکھا تھا۔ انھوں نے مزید کہا، میرے لیے بغلی قبر (لحد) کھودنا اور اس پر کچی اینٹیں کھڑی کر دینا جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تدفین کی گئی تھی۔ حضرت سعد کی میت مدینہ لائی گئی، گورنر مدینہ مروان نے نماز جنازہ پڑھائی۔ سیدہ عائشہ نے حکم دیا، حضرت سعد بن ابی وقاص کے جنازہ کو مسجد نبوی میں سے گزارا جائے تاکہ وہ ان کی نماز جنازہ ادا کر سکیں۔ لوگوں نے اعتراض کیا تو انھوں نے جواب دیا، لوگ کتنی جلد باتیں بھول جاتے ہیں، کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سہیل بن بیضا (اور ان کے بھائی) کی نماز جنازہ مسجد میں ادا نہ فرمائی تھی؟ چنانچہ میت ازواج مطہرات کے حجروں کے آگے رکھی گئی اور انھوں نے الگ نماز جنازہ ادا کی۔ حضرت سعد کو جنت البقیع میں دفن کیا گیا۔ حضرت سعد کی میراث کی کل مالیت اڑھائی لاکھ درہم تھی۔ اس کی زکوٰۃ کے ۵ ہزار درہم وہ مروان کو بھجوا چکے تھے۔ حضرت عمر نے عراق (کوفہ) کی امارت سے معزول کرتے ہوئے ان کا مال تقسیم کرا دیا تھا۔

حضرت سعد بن ابی وقاص کا قد چھوٹا، جسم بھاری، کندھے چوڑے، انگلیاں موٹی اور ناک چپٹی تھی۔ ان کے جسم پر بہت بال تھے۔ سر اور ڈاڑھی کے بالوں پر خضاب لگاتے تھے۔ اونی کپڑے اور سونے کی انگوٹھی پہنتے تھے۔ تسبیح کرتے تو گنتی کنکریوں پر کرتے۔ حضرت سعد کی مختلف اوقات میں کل ۱۰ ازواج رہیں جن سے ان کے ۱۴ بیٹے اور ۱۷ بیٹیاں ہوئیں۔ ازواج کے نام اور ان سے پیدا ہونے والی اولاد کی تفصیل یہ ہے۔ (۱) شہاب بن عبداللہ کی بیٹی سے جن کا نام معلوم نہیں، بڑے بیٹے اسحاق (اکبر) جن سے حضرت سعد کنیت کرتے تھے اور ام حکم (کبریٰ) نے جنم لیا۔ (۲) ماویہ (بشری) بنت قیس سے پیدا ہونے والی اولاد: عمر، اسے مختار نے قتل کرا دیا۔ محمد، انہیں حجاج نے مروا دیا۔ حفصہ، ام قاسم اور ام کلثوم۔ (۳) ام عامر بنت عمرو، ان سے عامر، اسحاق (اصغر) اسماعیل اور ام عمران پیدا ہوئے۔ (۴) بنو تغلب کی سلمیٰ سے عبداللہ (اکبر) ہوئے۔ (۵) خولہ بنت عمرو سے مصعب کی پیدائش ہوئی۔ (۶) ام ہلال بنت ربیع سے ہونے والی اولاد: عبداللہ (اصغر)، عبدالرحمان بجیر اور حمیدہ۔ (۷) ام حکیم بنت

قارظ سے عمیر (اکبر) اور حمنہ پیدا ہوئے۔(۸) سلمیٰ بنت خصفہ (حفص) سے عمیر (اصغر)، عمرو، عمران، ام عمرو، ام ایوب اور ام اسحاق کی ولادت ہوئی۔(۹) طیبہ بنت عامر سے صالح ہوئے۔(۱۰) ام حجیر سے پیدا ہونے والی اولاد: عثمان اور رملہ۔زبد بنت حارث سے جو جنگ میں قید ہو کر آئیں، جنم لینے والی اولاد: ابراہیم، موسیٰ، ام حکم (صغریٰ)، ام عمرو، ہند، ام زبیر اور ام موسیٰ۔ان کے علاوہ جنگ سے ملنے والی باندیوں سے عمرہ اور عائشہ ہوئیں۔ حضرت سعد کہتے تھے، جب میں نے جنگ بدر میں حصہ لیا، میرے چہرے پر ایک بال تھا جسے میں چھو سکتا تھا۔اب اللہ نے میری ڈاڑھی وافر کر دی ہے۔یعنی پہلے ایک ہی بیٹی تھی، اب بہت سی اولاد ہو گئی ہے۔مشہور شافعی فقیہ عمر بن ابراہیم حضرت سعد بن ابی وقاص کی نسل میں سے تھے۔ان کی تاریخ وفات ۴۳۴ھ ہے۔

مطالعۂ مزید: السیرۃ النبویہ (ابن ہشام)، الطبقات الکبری (ابن سعد)، الجامع المسند الصحیح (بخاری، شرکۃ دار الارقم)، المسند الصحیح المختصر من السنن (مسلم، شرکۃ دار الارقم)، تاریخ الامم والملوک (طبری)، معجم الصحابہ (بغوی)، الکامل فی التاریخ (ابن اثیر)، اسد الغابہ فی معرفۃ الصحابہ (ابن اثیر)، تہذیب الکمال فی اسماء الرجال (مزی)، سیر اعلام النبلاء (ذہبی)، البدایہ والنہایہ (ابن کثیر)، فتح الباری (ابن حجر)، الاصابہ فی تمییز الصحابہ (ابن حجر)، الفاروق عمر (محمد حسین ہیکل)، اردو دائرۂ معارف اسلامیہ (مقالہ: K.V.Zetterstein)

خورشید احمد ندیم

# پہلے اپنا گریبان!



فصیلِ وطن پر تازہ لہو کے چھینٹے ہیں۔

یہاں پینے کو پانی نہیں ہے لیکن انسانی خون ارزاں ہے۔ سیاست، مذہب، سماج، معاش ـــــ ہر عنوان لہو رنگ ہے۔ کراچی میں ہر روز انسانی خون بہتا ہے۔ اس کا عنوان سیاست ہے۔ فکر و نظر کا اختلاف عبادت گاہوں کو مقتل اور زندہ انسانوں کو لاشوں میں بدل دیتا ہے۔ اس کا عنوان مذہب ہے۔ غیرت کے نام پر یا جائداد کے لیے بہنوں اور بھائیوں کو مار دیا جاتا ہے۔ اس کا عنوان سماج ہے۔ پیٹ میں روٹی نہ ہو یا بچوں کی ناتمام خواہشیں پریشان کریں تو لاشیں کمروں میں لٹکتی ہوئی ملتی ہیں۔ اس کا عنوان معاش ہے۔ اس اظہار کا ایک ہی اسلوب باقی ہے ـــــ خود مر جاؤ یا دوسروں کو مار دو ـــــ جب معاشرہ یہاں کھڑا ہو اور اللہ کا حق اپنے ہاتھ میں لے لے تو پھر اللہ کی رحمت کو متوجہ کرنے کے لیے، اس طرزِ عمل سے رجوع، سب سے پہلے لازم ہے۔ افسوس کہ یہی بات یہی ہمارے مقدر میں نہیں ہے۔ شہباز بھٹی قتل ہوئے۔ اب ہم امریکا کی طرف دیکھیں گے، بھارت میں جھانکیں گے، عالمی سیاست میں اسباب تلاش کریں گے، ہر جگہ دیکھیں گے لیکن وہاں نہیں دیکھیں گے جو سب سے قریب ہے ـــــ ہمارا اپنا گریبان۔

سیاست، مذہب اور سماج کا ہر قابلِ ذکر فرد اس قتل کی مذمت کر رہا ہے۔ یقیناً اخلاص کے ساتھ۔ میں دلوں میں نہیں جھانک سکتا اس لیے مجھ پر لازم ہے کہ میں ان کی بات پر یقین کروں الاّ یہ کہ شواہد دوسری بات کہہ رہے ہوں۔ میرے سامنے اس وقت ایسی کوئی شہادت نہیں کہ جو ان کے دعوے کو جھٹلا رہی ہے۔ بایں ہمہ یہ سوال مجھے ضرور پریشان کرتا ہے یہ قاتل کون ہیں؟ جو بہنوں کو اپنی مرضی سے شادی کرنے پر مار دیتے ہیں، جو معاشی مسئلے کا حل خودکشی کو سمجھتے ہیں، جو اختلافِ رائے کو ''مجرم'' کی سزا صرف اور صرف موت قرار دیتے ہیں، جو سیاست میں مخالفین کو قتل

کرتے ہیں، یہ سب کہاں سے آتے ہیں؟ یقیناً امریکا بھیجتا ہے اور بلاشبہ بھارت بھی لیکن کیا یہ سب امریکی اور بھارتی ہیں؟ کیا ہر خودکشی کرنے والا امریکی ہے؟ کیا ہر بہن کا قاتل بھارتی ہے؟ ان سوالات کے جواب کے لیے اپنے گریبان میں جھانکنا ضروری ہے اور یہی کام ہمیں سب سے مشکل دکھائی دیتا ہے۔ ہر گریبان ہماری دسترس میں ہے، سوائے اپنے گریبان کے۔

میں اپنے آپ کو دہراتا ہوں کہ کوئی واقعہ منفرد نہیں ہوتا۔ وہ ایک سلسلۂ واقعات کی کڑی ہوتا ہے۔ میرے نزدیک مولانا حسن جان، مفتی محمد سرفراز نعیمی، سلمان تاثیر، بلوچستان میں زندہ درگور ہونے والی بیٹیاں اور شہباز بھٹی، سب کو ایک ساتھ رکھ کر بات کو سمجھنا ہوگا۔ لاریب، انھیں قتل کرنے والے مختلف لوگ ہیں اور ان کے محرکات بھی مختلف ہیں لیکن، سب کے پس منظر میں ایک ہی سوچ (mindset) ہے۔ اس کو جاننا، سمجھنا اور پھر حسب نظر ثانی ہی، اپنے گریبان میں جھانکنا ہے۔

میں جب بادل ناخواستہ، اپنے گریبان میں دیکھتا ہوں تو مجھ پر یہ منکشف ہوتا ہے کہ ہم اس وقت ایک معاشرتی المیے کا شکار ہیں جس کا عنوان ہے ''عدم برداشت''۔ ہم اپنے اپنے دائرے میں مطلق اختیار چاہتے ہیں۔ ہم اپنی رائے کو دنیا کی واحد سچائی سمجھتے ہیں۔ ہم اپنی تعبیر مذہب کو وحی قرار دیتے ہیں جس سے اختلاف کفر ہے۔ ہم یہ تمنا کرتے ہیں کہ ہماری جماعت کے علاوہ میدان سیاست میں کوئی دوسری جماعت نہیں ہونی چاہیے۔ ہم گھر میں ہیں تو خاندان کا ہر فرد ہماری مرضی سے اپنی شادی کا فیصلہ کرے۔ ہماری مرضی سے یہ طے ہو کہ بچے کو بڑا ہو کر ڈاکٹر بننا ہے یا عالم۔ جب ایسا نہیں ہوتا تو ہم تشدد پر اتر آتے ہیں۔ ہم سیاست میں ہوں تو اپنے پرتشدد رویے کی سیاسی تعبیر کرتے ہیں۔ ہم اہل مذہب ہیں تو تشدد کے لیے مذہبی استدلال مرتب کرتے ہیں۔ ہمارے جرم کا تعلق سماج سے ہو تو ہم سماجی روایت کا سہارا لیتے ہیں۔ اس طرح ہم سیاسی رویے، اپنی مذہبی تعبیر اور سماجی روایت کو پیمانہ مان کر آگے بڑھتے ہیں اور جرم کو سیاسی، مذہبی اور سماجی طور پر قابل قبول بنا لیتے ہیں۔ جب ہم ان پر ایمان لے آتے ہیں تو ایک غلط بات کو قبولیت عامہ کی سند مل جاتی ہے اور پھر اس قبولیت کو ہم اپنے جرم کے لیے بطور جواز پیش کرتے ہیں۔ ہم اپنی فلموں میں ایسے کرداروں کو ہیرو بنا کر سامنے لاتے ہیں جو قانون کو ہاتھ میں لیتا اور قتل کا مرتکب ہوتا ہے۔ جسے ہم آئیڈیل ماں کے روپ میں پیش کرتے ہیں، وہ بچے سے یہ کہتی ہے کہ اگر اس نے اپنے باپ کے قاتلوں کو نہ مارا تو وہ اسے اپنا دودھ نہیں بخشے گی اور جب وہ قتل کرتا ہے تو وہ اسے داد دیتے ہوئے کہتی ہے: ''سر اٹھا کے چلو، ۳۰۲ کا مقدمہ ہے کوئی مذاق نہیں۔'' جب سیاسی مزاج، مذہبی تعبیرات اور سماجی رویے قتل جیسے جرم کی سرپرستی کریں اور قاتلوں کو ہیرو

بنائیں تو اس کے بعد وہی کچھ ہوگا جو ہو رہا ہے۔

شہباز بھٹی کے قتل کا کوئی تعلق اقلیتوں کے معاملے سے نہیں ہے۔ یہ نتیجہ آپ اسی وقت نکالتے ہیں جب اسے ایک منفرد واقعے کے طور پر دیکھتے ہیں۔ میں نے جن لوگوں کے نام گنوائے ہیں، ان میں سے کسی کا تعلق اقلیتوں سے نہیں ہے۔ یہ سیدھا سادہ عدم برداشت کا معاملہ ہے۔ ہم اس سماجی برائی کو بطور معاشرہ آخری درجے میں قبول کر چکے ہیں۔ آخری درجہ یہی ہے کہ قتل جیسے جرم کو قبولیت عامہ حاصل ہو جائے۔ سماج کو اس سطح تک پہنچانے میں ہم سب شریک ہیں اور سب سے زیادہ رائے ساز۔ اس کا ایک ہی علاج ہے کہ ہم سب مل کر اپنے ہاتھوں سے اس زہر کو سمیٹیں جو ہم نے معاشرے میں پھیلایا ہے۔

o اہل سیاست اپنے حامیوں کو بتائیں کہ سیاسی اختلافات کے بعد دوسرے کا قتل روا نہیں ہو جاتا اور اگر کوئی کارکن اس میں ملوث ہو تو اس سے اعلان لاتعلقی کریں۔ وہ اپنے مخالفین پر تنقید کریں لیکن موقف جتنا بھی سخت ہو، لہجہ دھیما ہو۔ آخر ابوالکلام اور محمد علی جناح جیسے سیاست دانوں نے بھی اختلاف کیا۔ کیا انھوں نے اپنے حامیوں کو یہی سکھایا کہ دوسروں کی گردن ماردو؟

o علما لوگوں کو تلقین کریں کہ محراب و منبر سے جو دین بتایا جاتا ہے وہ ہمارے فہم کا نتیجہ ہے اور اس میں غلطی ہو سکتی ہے۔ انسانوں کی رائے بدلتی رہتی ہے اور ہماری رائے بھی بدل سکتی ہے۔ مولانا اشرف علی تھانوی نے اپنی کئی آرا سے رجوع کیا اور پھر کتاب لکھ کر لوگوں کو بتایا کہ فلاں فلاں مسئلے میں میرا نقطۂ نظر تبدیل ہو گیا ہے۔ میرے نزدیک ان کی پہلی رائے سد دیانت دارانہ تھی اور دوسری بھی۔ ان کی دیانت کا اس سے بڑھ کر ثبوت کیا ہو سکتا ہے کہ انھوں نے اپنی بات سے اعلانیہ رجوع کیا۔

o سول سوسائٹی سماج کو بتائے کہ انسانی جان کی حرمت کیا ہے اور اسے لینے کا اختیار اللہ تعالیٰ اور اسی کے حکم سے ریاست کے سوا کسی کو نہیں۔

یہ اسی وقت ہوگا جب ہم اپنے گریبان میں جھانکیں گے۔ ہم امریکا کی طرف دیکھیں گے تو ڈیوس جیسے کردار ملیں گے جو کسی جرم میں بھی ملوث ہو سکتے ہیں۔ ہمیں بھارتی ایجنٹ بھی ملیں گے جو دھماکے کروا رہے ہوں گے۔ لیکن یہ چند منفرد واقعات ہوں گے۔ ہمارا اصل مسئلہ داخلی ہے۔ بطور سماج ہماری اقدار بدل رہی ہیں۔ اگر آپ کو میری بات سے اختلاف ہے تو ایک لمحے کے لیے اپنے گریبان میں منہ ڈالیے اور یہ سوچیے کہ جن لوگوں سے آپ سیاسی، مذہبی یا سماجی طور پر اختلاف رکھتے ہیں، ان کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟ اگر انھیں مار دیا جائے تو آپ کے

جذبات کیا ہوں گے؟ ان کے مارے جانے پر آپ کوئی دلیل تلاش کریں گے یا اس کی مذمت کریں گے؟ ان سوالات کے جواب تلاش کرنا ہم سب کا کام ہے لیکن اس کے لیے شرط وہی ہے ــــــ پہلے اپنا گریبان!

محمد عمار خان ناصر

# قتال اور دین کے معاملے میں جبر و اکراہ

['' نقطۂ نظر'' کا یہ کالم مختلف اصحاب فکر کی نگارشات کے لیے مختص ہے۔ اس میں شائع ہونے والے مضامین سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

(۸)

(گذشتہ سے پیوستہ)



قرآن مجید نے بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ پیغمبر کی قوم کو مختلف جسمانی اور معاشی تکالیف میں مبتلا کرتے ہیں تاکہ وہ متنبہ ہو کر اللہ کی طرف رجوع کریں، لیکن جب وہ کوئی سبق نہیں سیکھتے تو ان پر مال و دولت اور سامان عیش کی فراوانی کر دی جاتی ہے، یہاں تک کہ وہ غفلت کا شکار ہو جاتے ہیں اور پھر اچانک خدا کا عذاب ان پر آن پڑتا ہے:

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا إِلَى أُمَمٍ مِّن قَبْلِكَ فَأَخَذْنَاهُم بِالْبَأْسَاء وَالضَّرَّاء لَعَلَّهُمْ يَتَضَرَّعُونَ فَلَوْلا إِذْ جَاءهُمْ بَأْسُنَا تَضَرَّعُواْ وَلَكِن قَسَتْ قُلُوبُهُمْ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ مَا كَانُواْ يَعْمَلُونَ فَلَمَّا نَسُواْ مَا ذُكِّرُواْ بِهِ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ أَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ حَتَّى إِذَا فَرِحُواْ بِمَا أُوتُواْ أَخَذْنَاهُم بَغْتَةً فَإِذَا هُم مُّبْلِسُونَ فَقُطِعَ

''اور یقیناً ہم نے تم سے پہلے بہت سی امتوں کی طرف رسول بھیجے تو انھیں جسمانی اور مالی تکلیفوں میں مبتلا کیا تاکہ وہ عاجزی اختیار کریں۔ تو کیوں نہ ایسا ہوا کہ جب ان پر ہمارا عذاب آیا تو وہ عاجزی کرتے۔ مگر ان کے دل سخت ہو گئے اور شیطان نے ان کے اعمال کو ان کے سامنے خوب صورت بنا دیا۔ پھر جب انھوں نے یاد دہانی کی ان باتوں کو فراموش کر دیا جو انھیں کی گئی تھی تو ہم نے ان پر ہر چیز کے

دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ. (الانعام ۶: ۴۲-۴۵)

دروازے کھول دیے۔ یہاں تک کہ جب وہ ان چیزوں پر جو ان کو دی گئیں، خوش ہو گئے تو ہم نے اچانک ان کو آ پکڑا اور پھر نا گہاں وہ مایوس ہو کر رہ گئے۔ پھر ان لوگوں کی جنھوں نے ظلم کیا، جڑ کاٹ دی گئی اور تعریف کا سزاوار اللہ، جہانوں کا پروردگار ہی ہے۔''

قرآن کی رو سے عذاب الٰہی کے یہ واقعات عبرت کی غرض سے رونما کیے جاتے ہیں تاکہ دنیا کے باقی لوگ ان سے سبق سیکھیں اور الٰہی ہدایت کے انکار اور اس کو جھٹلانے سے باز رہیں، چنانچہ ان قوموں پر دنیا میں آنے والے عذاب کو وہ آخرت کے عذاب کی ایک نشانی اور یاد دہانی قرار دیتا ہے جس سے واضح ہے کہ دنیا کے عذاب کا باعث اور علت بھی وہی ہے جس کی بنیاد پر آخرت میں اہل کفر عذاب الٰہی کے سزاوار قرار پائیں گے:

وَكَذٰلِكَ أَخْذُ رَبِّكَ إِذَا أَخَذَ الْقُرٰى وَهِيَ ظَالِمَةٌ إِنَّ أَخْذَهُ أَلِيْمٌ شَدِيْدٌ إِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَآيَةً لِّمَنْ خَافَ عَذَابَ الْآخِرَةِ ذٰلِكَ يَوْمٌ مَّجْمُوْعٌ لَّهُ النَّاسُ وَذٰلِكَ يَوْمٌ مَّشْهُوْدٌ. (ہود ۱۱: ۱۰۲، ۱۰۳)

''اور تیرے رب کی گرفت ایسی ہی ہوتی ہے جب وہ بستیوں کو اس وقت پکڑتا ہے جب وہ ظلم کرتی ہیں۔ بے شک اس کی گرفت بہت دردناک اور سخت ہے۔ اس میں نشانی ہے ان کے لیے جو آخرت کے عذاب سے ڈرتے ہیں۔ یہ وہ دن ہے جب میں سب لوگوں کو جمع کیا جائے گا اور یہ وہ دن ہے جب سب (خدا کے سامنے) حاضر ہوں گے۔''

منکرین حق کے مواخذہ کے حوالے سے اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ قانون کی مذکورہ تفصیلات پیش نظر رہیں تو وہ الجھن بالکل رفع ہو جاتی ہے جس کا سامنا زیر بحث زاویہ نگاہ کو ہے، یعنی یہ کہ جب دین کے معاملے میں جبر و اکراہ درست نہیں تو پھر کفار کے خلاف قتال کا باعث ان کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہ لانے کو کیونکر قرار دیا جا سکتا ہے۔ ہم نے قرآن مجید میں ان آیات کے سیاق وسباق کی روشنی میں واضح کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں اپنے لیے مقرر کردہ کسی قانون یا اپنے اوپر عائد کردہ کسی پابندی کا ذکر نہیں کیا جس سے یہ اخذ کیا جا سکے کہ وہ رسولوں کے ذریعے سے اتمام حجت کے بعد ایمان نہ لانے والوں کو بھی اس دنیا میں کسی سزا کا مستوجب نہیں ٹھہرائے گا، بلکہ محض اس معیار کو بیان کیا ہے جو اس کے نزدیک تکوینی سطح پر ہدایت اور ایمان کی توفیق بخشنے کے لیے شرط کی حیثیت رکھتا

ہے۔مزید یہ کہ قرآن میں اہل حق کی ذمہ داری کو 'بلاغ مبین' تک محدود قرار دینے کی جو بات بیان ہوئی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان ازخود اپنے اجتہاد سے کسی فرد یا گروہ کو سزا کا مستحق قرار دے کر اس کے خلاف کوئی اقدام نہیں کر سکتے۔کسی فرد یا قوم پر حجت کے تمام ہو جانے اور پھر اس کے بعد اس کو عذاب کا مستحق قرار دینے کا معاملہ سرتاسر خدا کے علم اور اس کے ارادے پر منحصر ہے اور کسی انسان، حتیٰ کہ کسی قوم کی طرف مبعوث کیے جانے والے پیغمبر کو بھی اس کا اختیار حاصل نہیں۔پیغمبر سمیت ہر داعی حق کی ذمہ داری بس یہ ہے کہ وہ حق کا پیغام بے کم وکاست لوگوں تک پہنچا دے، الا یہ کہ خود اللہ تعالیٰ پیغمبر یا اس کے ساتھیوں کو کسی فرد یا گروہ کے خلاف اقدام کرنے کا حکم یا اجازت دے دیں۔عذاب کے سزاوار قرار پانے والے گروہوں کی تحدید وتعیین سے لے کر ان کو دی جانے والی مہلت کے خاتمے اور ان پر سزا کے نفاذ تک کے تمام فیصلے براہ راست بارگاہ الٰہی سے صادر ہوتے ہیں جبکہ اہل ایمان اس حکم پر محض فرمان الٰہی کی تعمیل میں عمل پیرا ہوتے اور اللہ کے فیصلے کو اسی کے حکم سے اسی فرد یا گروہ پر نافذ کرنے کے پابند ہوتے ہیں جس پر نافذ کرنے کا انھیں اختیار دیا گیا ہو۔دوسرے لفظوں میں یہ ایک خدائی فیصلہ ہوتا ہے جس کی تنفیذ کے لیے انسانی ہاتھ وہی کردار ادا کرتے ہیں جو تدبیر امور کے وسیع تر دائرے میں خدا کے فرشتے خدا کے فیصلوں کی تنفیذ کے لیے ادا کرتے ہیں۔چنانچہ قرآن مجید نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے 'لیس لك من الامر شئ او یتوب علیهم او یعذبهم' (آل عمران ۳: ۱۲۸) اور 'انما علیك البلغ وعلینا الحساب' (الرعد ۱۳: ۴۰) کے الفاظ میں اصولی طور پر بھی اس بات کو واضح فرمایا ہے اور منکرین حق کے خلاف قتال کے احکام کے ضمن میں بھی جگہ جگہ اس کی وضاحت کی ہے کہ یہ جنگ دراصل خدا کا عذاب ہے جسے ان پر نازل کرنے کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کے سپرد کی ہے۔یہ تصریحات حسب ذیل ہیں:

مکہ مکرمہ میں تیرہ سال تک دعوت وتبلیغ کے بعد بھی قریش من حیث القوم آپ پر ایمان نہ لائے تو اتمام حجت کے بعد ان پر عذاب نازل کرنے کا فیصلہ فرما دیا گیا۔تاہم بہت سی حکمتوں اور مصلحتوں کے تحت ان کو کلیتاً نابود کر دینے کے بجائے ایک تدریج کے ساتھ ان کے ضدی اور معاند عناصر کا صفایا کرنے کی حکمت عملی اختیار کی گئی۔اس ضمن میں مکی دور میں ہی مشرکین کو عذاب الٰہی کی ممکنہ صورتوں میں سے ایک صورت یہ بتا دی گئی کہ اہل حق کی قوت بازو منکرین کو ان کے کفر کا مزہ چکھا دے:

| | |
|---|---|
| قُلۡ هُوَ الۡقَادِرُ عَلٰۤى اَنۡ يَّبۡعَثَ عَلَيۡكُمۡ عَذَابًا مِّنۡ فَوۡقِكُمۡ اَوۡ مِنۡ تَحۡتِ | ''کہہ دو کہ وہ اس پر قادر ہے کہ چاہے تو تم پر تمہارے اوپر سے یا نیچے سے تم پر کوئی عذاب مسلط کر دے یا |

أَرُجُلِكُمُ أَوُ يَلُبِسَكُمُ شِيَعاً وَيُذِيقَ بَعُضَكُم بَأُسَ بَعُضٍ انظُرُ كَيُفَ نُصَرِّفُ الآيَاتِ لَعَلَّهُمُ يَفُقَهُونَ ـ وَكَذَّبَ بِهِ قَوُمُكَ وَهُوَ الُحَقُّ قُل لَّسُتُ عَلَيُكُم بِوَكِيُلٍ ـ لِّكُلِّ نَبإٍ مُّسُتَقَرٌّ وَسَوُفَ تَعُلَمُونَ. (الانعام۶: ۶۵-۶۷)

تمھارے مختلف گروہ بنا کر تمھیں آپس میں بھڑا دے اور ایک دوسرے کی پکڑ کا مزہ چکھا دے۔ دیکھو ہم کس کس انداز سے نشانیوں کو بیان کرتے ہیں تاکہ یہ سمجھ جائیں۔ اور تیری قوم نے اس عذاب کو جھٹلا دیا حالانکہ اس کا آنا لازم ہے۔تم کہہ دو کہ میں اس کو منوانے کے لیے تم پر مسلط نہیں کیا گیا۔ ہر عذاب کے آنے کا وقت بالکل مقرر ہے اور عنقریب تم جان لو گے۔‘‘

یہ عذاب ان پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کرنے کے بعد مسلمانوں کے ہاتھوں قتل کی صورت میں نازل ہونا شروع ہوا۔

ہجرت مدینہ کے بعد اہل کفر کے خلاف لڑائی کے باقاعدہ آغاز سے پہلے سورۂ محمد میں مسلمانوں سے کہا گیا کہ جب میدان جنگ میں ان کا دشمن سے آمنا سامنا ہو تو وہ اچھی طرح ان کی گردنیں ماریں اور پھر خوب خون ریزی کے بعد ان کو باندھ کر قیدی بنالیں۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے یہ بھی واضح فرما دیا کہ یہ دراصل اللہ تعالیٰ کا انتقام ہوگا جو وہ مسلمانوں کے ہاتھوں سے کفار سے لے گا:

فَإِذا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا فَضَرُبَ الرِّقَابِ حَتَّى إِذَا أَثُخَنتُمُوهُمُ فَشُدُّوا الُوَثَاقَ فَإِمَّا مَنّاً بَعُدُ وَإِمَّا فِدَاء حَتَّى تَضَعَ الُحَرُبُ أَوُزَارَهَا ذَلِكَ وَلَوُ يَشَاءُ اللَّهُ لَانتَصَرَ مِنُهُمُ وَلَكِن لِّيَبُلُوَ بَعُضَكُم بِبَعُضٍ وَالَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَلَن يُضِلَّ أَعُمَالَهُمُ. (محمد۴۷: ۴)

’’پھر جب کفار کے ساتھ تمھاری مڈبھیڑ ہو تو خوب ان کی گردنیں مارو۔ یہاں تک کہ جب اچھی طرح ان کی خون ریزی کر چکو تو انھیں مضبوط باندھ لو۔ پھر اس کے بعد یا تو احسان کر کے چھوڑ دینا ہے یا فدیہ لے کر رہا کر دینا۔ (ان کے ساتھ لڑائی جاری رکھو) یہاں تک کہ جنگ اپنے ہتھیار ڈال دے۔ اور اگر اللہ چاہتا تو خود ہی ان سے انتقام لے لیتا، لیکن (اس نے تمھیں اس کا حکم دیا ہے) تاکہ وہ تم میں سے بعض کو بعض کے ذریعے آزمائے۔ اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل کیے جائیں گے، اللہ ان کے اعمال کو ہرگز

اکارت نہیں جانے دے گا۔“

مشرکین قریش پر یہ عذاب بالفعل غزوۂ بدر میں نازل ہوا۔ قرآن مجید نے بتایا ہے کہ عذاب کے اس فیصلے پر عمل درآمد کو یقینی بنانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے تکوینی لحاظ سے مداخلت کرتے ہوئے ان تمام اسباب کو ختم کر دیا جو اس معرکے کے برپا ہونے میں رکاوٹ بن سکتے تھے۔ مثال کے طور پر ایسے حالات پیدا کر دیے گئے کہ بعض اہل ایمان کی خواہش کے برعکس، شام سے لوٹنے والے قریش کے تجارتی قافلے کے بجائے مکے سے آنے والے لشکر کے ساتھ مسلمانوں کا ٹکراؤ ناگزیر ہو گیا:

وَإِذْ يَعِدُكُمُ اللّهُ إِحْدَى الطَّائِفَتِيْنِ أَنَّهَا لَكُمْ وَتَوَدُّونَ أَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُونُ لَكُمْ وَيُرِيدُ اللّهُ أَن يُحِقَّ الحَقَّ بِكَلِمَاتِهِ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكَافِرِينَ ۔ لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُونَ. (الانفال ۸: ۷-۸)

”اور جب اللہ تم سے وعدہ کر رہا ہے کہ دونوں گروہوں میں سے ایک سے تمھارا واسطہ پڑے گا، اور تم یہ پسند کرتے تھے کہ کیل کانٹے کے بغیر آنے والا قافلہ تمھیں ملے، لیکن اللہ کا ارادہ یہ تھا کہ وہ اپنے کلمات کے ذریعے سے حق کو سربلند کر دے اور کافروں کی جڑ کاٹ کر رکھ دے۔“

إِذْ أَنتُم بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا وَهُم بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوَى وَالرَّكْبُ أَسْفَلَ مِنكُمْ وَلَوْ تَوَاعَدتُّمْ لاَخْتَلَفْتُمْ فِيْ الْمِيعَادِ وَلَـكِن لِّيَقْضِيَ اللّهُ أَمْراً كَانَ مَفْعُولاً.

(الانفال ۸: ۴۲)

”اور اگر تم باہم طے کر کے لڑائی کے لیے نکلتے تو مقررہ وقت یا جگہ پر اکٹھے نہ پہنچتے، لیکن اللہ نے یہ اس لیے کیا کہ ایک طے شدہ فیصلے کو نافذ کر دے۔“

اسی طرح دونوں گروہوں کو میدان جنگ میں اترنے پر آمادہ کرنے کے لیے دونوں کی تعداد کو بھی ایک دوسرے کی نگاہ میں کم کر کے دکھایا گیا:

إِذْ يُرِيكَهُمُ اللّهُ فِيْ مَنَامِكَ قَلِيلاً وَلَوْ أَرَاكَهُمْ كَثِيراً لَّفَشِلْتُمْ وَلَتَنَازَعْتُمْ فِيْ الأَمْرِ وَلَـكِنَّ اللّهَ سَلَّمَ إِنَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ۔ وَإِذْ يُرِيكُمُوهُمْ إِذِ الْتَقَيْتُمْ فِيْ أَعْيُنِكُمْ قَلِيلاً وَيُقَلِّلُكُمْ فِيْ أَعْيُنِهِمْ

”جب اللہ نے خواب میں تمھیں ان کی تعداد تھوڑی دکھائی۔ اگر وہ تمھیں ان کی تعداد زیادہ دکھاتا تو تمھاری ہمت پست ہو جاتی اور تم اس معاملے میں باہم نزاع کرنے لگ جاتے، لیکن اللہ نے (تمھیں اس آزمائش سے) بچا لیا۔ بے شک وہ دلوں کیفیت

لِيَقْضِيَ اللّهُ أَمْراً كَانَ مَفْعُولاً وَإِلَى اللّهِ تُرْجَعُ الأُمُورُ. (الانفال۸: ۴۳، ۴۴)

کو خوب جانتا ہے۔ اور وہ وقت بھی یاد کرو کہ تمھارا آمنا سامنا ہوا تو اللہ انھیں تمھاری نگاہوں میں تھوڑا کر کے اور ان کی نظروں میں تمھاری تعداد کو کم کر کے دکھا رہا تھا تاکہ اللہ اس فیصلے کو روبہ عمل کر دے جس کو بہر حال ہونا ہی تھا۔''

بدر کے معرکے میں قریش کے بڑے بڑے سردار مسلمانوں کے ہاتھوں تہ تیغ ہوئے۔ اگرچہ عام انسانی اخلاقیات کے لحاظ سے بھی مسلمانوں کے پاس اس جنگ کا پورا پورا جواز موجود تھا، لیکن قرآن مجید نہایت اصرار کے ساتھ اس بات کو نمایاں کرتا ہے کہ یہ درحقیقت اللہ کا عذاب تھا جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کے نتیجے میں اہل ایمان کے ہاتھوں قریش پر نازل کیا گیا:

ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ شَآقُّواْ اللّهَ وَرَسُولَهُ وَمَن يُشَاقِقِ اللّهَ وَرَسُولَهُ فَإِنَّ اللّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ۔ ذَلِكُمْ فَذُوقُوهُ وَأَنَّ لِلْكَافِرِينَ عَذَابَ النَّارِ. (الانفال۸: ۱۳، ۱۴)

''اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے اور اس کے رسول کے ساتھ دشمنی کی راہ اختیار کی اور جو اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ دشمنی کرے گا تو بے شک اللہ نہایت سخت سزا دینے والا ہے، سو اب اس عذاب کو چکھو۔ اور اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ بے شک منکروں کے لیے آگ کا عذاب ہے۔''

قرآن نے اسی پہلو سے غزوۂ بدر میں مشرکین کی ذلت اور رسوائی کو فرعون اور دوسرے منکرین حق پر نازل ہونے والے عذاب کے مثل قرار دیا ہے:

كَدَأْبِ آلِ فِرْعَوْنَ وَالَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ كَفَرُواْ بِآيَاتِ اللّهِ فَأَخَذَهُمُ اللّهُ بِذُنُوبِهِمْ إِنَّ اللّهَ قَوِيٌّ شَدِيدُ الْعِقَابِ. (الانفال۸: ۵۲)

''ان کا حال بھی وہی ہے جو آل فرعون اور ان سے پہلی قوموں کا تھا۔ انھوں نے اللہ کی آیات کو جھٹلایا تو اللہ نے ان کے گناہوں کی وجہ سے ان پر گرفت کی، اور اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔''

اس واقعے کے بعد اس حوالے سے قریش کو بالواسطہ مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

وَإِذْ قَالُواْ اللَّهُمَّ إِن كَانَ هَـذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِندِكَ فَأَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ

''اور یاد کرو جب انھوں نے کہا کہ اے اللہ، اگر یہی دین تیری طرف سے برحق ہے تو ہم پر آسمان سے

السَّمَـاءِ أَوِ ائْتِنَـا بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ۔ وَمَـا كَـانَ اللّٰـهُ لِيُعَـذِّبَهُمْ وَأَنتَ فِيهِمْ وَمَا كَـانَ اللّٰـهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُونَ ۔ وَمَـا لَهُمْ أَلَّا يُعَذِّبَهُمُ اللّٰهُ وَهُمْ يَصُدُّونَ عَـنِ الْـمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَمَا كَانُوا أَوْلِيَاءَهُ إِنْ أَوْلِيَـآؤُهُ إِلَّا الْـمُتَّـقُـونَ وَلَــكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ. (الانفال۸: ۳۲۔۳۴)

پتھر برسا یا کوئی اور دردناک عذاب ہم پر مسلط کر دے۔(اس سے پہلے تو) اللہ ان پر عذاب نازل نہیں کر سکتا تھا کیونکہ تم ان کے مابین موجود تھے اور نہ اللہ انھیں اس حال ہی میں سزا دے سکتا تھا کہ وہ گناہوں کی معافی مانگ رہے ہوں۔ (لیکن اب ہجرت کے بعد) اس میں کیا رکاوٹ تھی کہ اللہ ان پر عذاب نازل کرتا، جبکہ وہ مسجد حرام سے بھی روکتے ہیں حالانکہ وہ اس کی تولیت کے حقدار بھی نہیں۔ اس کے حقیقی متولی تو صرف پرہیز گار ہیں، لیکن ان میں سے اکثر لوگ نہیں جانتے۔''

قرآن مجید نے غزوۂ بدر کے تناظر میں یہ بات بھی واضح فرمائی ہے کہ چونکہ اس بات کا علم اللہ ہی کو ہے کہ منکرین میں سے کن کی صلاحیت ایمان بالکل سلب ہو چکی ہے اور کن کے حق میں ابھی ایمان لانے کا امکان موجود ہے، اس لیے قریش کے لشکر میں سے کچھ لوگ تو تہ تیغ کر دیے گئے لیکن باقی کو بچ کر واپس جانے کا موقع دیا گیا ہے:

لِيَقْـطَـعَ طَـرَفـاً مِّـنَ الَّـذِيْنَ كَفَرُوا أَوْ يَـكْبِتَهُـمْ فَيَـنقَلِبُوا خَآئِبِيْنَ ۔ لَيْسَ لَكَ مِـنَ الْأَمْـرِ شَـيْءٌ أَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ أَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَإِنَّهُمْ ظَالِمُونَ.

(آل عمران۳: ۱۲۸)

''تاکہ اللہ کافروں کی جماعت کے ایک حصے کو کاٹ ڈالے یا ان کو بری طرح رسوا کر دے تاکہ وہ نامراد واپس پلٹ جائیں۔ (اے پیغمبر) اس معاملے میں تمھارے پاس کوئی اختیار نہیں۔ اللہ خود ہی یا ان پر نظر عنایت کرے گا اور یا انھیں عذاب دے گا، کیونکہ یہ ظالم ہیں۔''

جہاد وقتال کے آخری مرحلے میں جب سورۂ توبہ میں مشرکین کو ایمان نہ لانے پر قتل کرنے کا حکم دیا گیا تو اس موقع پر بھی اس اقدام کی یہ حیثیت واضح کی گئی۔ ارشاد ہوا ہے:

فَـإِن تُبْتُـمْ فَهُـوَ خَيْـرٌ لَّـكُـمْ وَإِن تَوَلَّيْتُمْ فَـاعْـلَمُوا أَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللّٰهِ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا بِعَذَابٍ أَلِيمٍ. (التوبہ۹: ۳)

''پھر اگر تم ایمان لے آؤ تو یہی تمہارے لیے بہتر ہے، اور اگر اس سے گریز کرو گے تو جان لو کہ اللہ کی گرفت سے بچ کر کہیں نہیں جا سکتے اور ان کافروں

کے ایک دردناک عذاب کی خوش خبری سنا دو۔''

فرمایا:

قَاتِلُوهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِأَيْدِيكُمْ وَيُخْزِهِمْ وَيَنصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ وَيَشْفِ صُدُورَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِينَ ۔ وَيُذْهِبْ غَيْظَ قُلُوبِهِمْ وَيَتُوبُ اللّٰهُ عَلَى مَن يَشَاءُ وَاللّٰهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ. (التوبہ۹: ۱۴، ۱۵)

''ان سے لڑو تا کہ اللہ تمھارے ہاتھوں انھیں عذاب دے اور انھیں رسوا کرے اور ان کے خلاف تمھیں فتح عطا فرمائے اور مومنوں کے دلوں کو تسکین بخشے اور ان (کافروں) کے دلوں کے غیظ کو بھی دور کر دے۔ ہاں اللہ جس پر چاہے گا، عنایت فرمائے گا اور اللہ جاننے والا، حکمت والا ہے۔''

اکابر مفسرین نے بھی مشرکین عرب کے ساتھ کیے جانے والے جہاد و قتال کی تفسیر اسی مخصوص تناظر میں کی ہے۔

ابن زید فرماتے ہیں:

﴿فمهل الكافرين امهلهم رويدا﴾ قال مهلهم فلا تعجل عليهم تركهم حتى لما اراد الانتصار منهم امره بجهادهم وقتالهم والغلظة عليهم.

(تفسیر الطبری، ۳۰/۱۵۰)

''﴿فمهل الکافرین امهلهم رویدا﴾' کا مطلب یہ ہے کہ ان کو مہلت دو اور ان کے خلاف جلدی نہ کرو۔ اللہ نے ان کو چھوڑے رکھا، یہاں تک کہ جب ان سے انتقام لینا چاہا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ان کے ساتھ جہاد کرنے اور سخت رویہ اپنانے کا حکم دیا۔''

امام رازی لکھتے ہیں:

فان قيل لما كان حضوره فيهم مانعا من نزول العذاب عليهم فكيف قال قاتلوهم يعذبهم الله بايديكم قلنا المراد من الاول عذاب الاستيصال ومن الثانى العذاب الحاصل بالمحاربة والمقاتلة.

(مفاتیح الغیب، ۱۵/۱۵۸)

''اگر یہ سوال کیا جائے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنی قوم کے اندر موجود ہونا ان پر عذاب کے نازل ہونے میں رکاوٹ تھا تو پھر یہ کیوں کہا گیا کہ تم ان سے لڑو تا کہ اللہ تمھارے ہاتھوں سے ان پر عذاب نازل کرے؟ تو ہم اس کے جواب میں کہیں گے کہ جس عذاب کی نفی کی گئی ہے، وہ قریش کو بالکلیہ نابود کر دینے کا عذاب ہے، جبکہ جس عذاب کا حکم دیا گیا ہے،

انه تعالى لما بين ما انزله باهل بدر من الكفار عاجلا و آجلا كما شرحناه اتبعه بان بين ان هذه طريقته و سنته فى الكل فقال كداب آل فرعون والمعنى عادة هولاء فى كفرهم كعادة آل فرعون فى كفرهم فجوزى هولاء بالقتل والسبى كما جوزى اولئك بالاغراق. (۱۸۰/۱۵)

اس سے مراد جنگ اور قتال کے ذریعے سے حاصل ہونے والا عذاب ہے۔''

''اللہ تعالیٰ جب اس عذاب کی وضاحت کر چکے جو انھوں نے اہل بدر پر فی الفور یا بالمآل نازل کیا تو اس کے بعد اب فرمایا کہ (حق کے منکر) ہر گروہ کے ساتھ اللہ تعالیٰ یہی طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا کہ 'کداب آل فرعون'، جس کا معنی یہ ہے کہ انھوں نے بھی کفر میں وہی طریقہ اختیار کیا جو آل فرعون نے کیا تھا، اس لیے جیسے ان کو غرق کر دینے کی سزا دی گئی تھی، ان کو بھی قتل اور قید کی صورت میں سزا دی گئی ہے۔''

مولانا شبیر احمد عثمانیؒ لکھتے ہیں:

''قرآن کریم میں اقوام ماضیہ کے جو قصے بیان فرمائے ہیں، ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب کوئی قوم کفر و شرارت اور انبیاء علیہم السلام کی تکذیب وعداوت میں حد سے بڑھ جاتی تھی تو قدرت کی طرف سے کوئی تباہ کن آسمانی عذاب ان پر نازل کیا جاتا تھا جس سے ان کے سارے مظالم اور کفریات کا دفعۃً خاتمہ ہو جاتا تھا۔ 'فکلا اخذنا بذنبه فمنهم من ارسلنا عليه حاصبا و منهم من اخذته الصيحة و منهم من خسفنا به الارض و منهم من اغرقنا و ما كان الله ليظلمهم ولكن كانوا انفسهم يظلمون' (عنکبوت رکوع ۴) کوئی شبہ نہیں کہ عذاب کی یہ اقسام بہت سخت مہلک اور آیندہ نسلوں کے لیے عبرت ناک تھیں لیکن ان صورتوں میں معذبین کو دنیا میں رہ کر اپنی ذلت ورسوائی کا نظارہ نہیں کرنا پڑتا تھا اور نہ آیندہ کے لیے توبہ و رجوع کا کوئی امکان باقی رہتا تھا۔ مشروعیت جہاد کی اصلی غرض وغایت یہ ہے کہ مکذبین و متعنتین کو حق تعالیٰ بجائے بلاواسطہ عذاب دینے کے اپنے مخلص و وفادار بندوں کے ہاتھ سے سزا دلوائے۔ سزادہی کی اس صورت میں مجرمین کی رسوائی اور مخلصین کی قدر افزائی زیادہ ہے۔ وفادار بندوں کا نصرت وغلبہ علانیہ ظاہر ہوتا ہے۔ ان کے دل یہ دیکھ کر ٹھنڈے ہوتے ہیں کہ جو لوگ کل تک انھیں حقیر و ناتواں سمجھ کر ظلم و ستم اور استہزا و تمسخر کا تختۂ مشق بنائے ہوئے تھے، آج خدا کی تائید و رحمت سے انھی کے رحم و کرم یا عدل و انصاف پر چھوڑ دیے گئے ہیں۔ کفر و باطل کی شوکت ونمائش کو دیکھ کر جو اہل حق

گھٹتے رہتے تھے یا جو ضعیف و مظلوم مسلمان کفار کے مظالم کا انتقام نہ لے سکنے کی وجہ سے دل ہی دل میں غیظ کھا کر چپ ہو رہتے تھے، جہاد فی سبیل اللہ کے ذریعہ سے ان کے قلوب تسکین پاتے تھے اور آخری بات یہ ہے کہ خود مجرمین کے حق میں بھی سزا دہی کا یہ طریقہ نسبۃً زیادہ نافع ہے کیونکہ سزا پانے کے بعد بھی رجوع وتوبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ حالات سے عبرت حاصل کر کے بہت سے مجرموں کو توبہ نصیب ہو جائے، چنانچہ حضور پرنور صلعم کے زمانہ میں ایسا ہی ہوا کہ تھوڑے دنوں میں سارا عرب صدق دل سے دین الٰہی کا حلقہ بگوش ہو گیا۔''
(تفسیر عثمانی، ص ۲۵۰، ۲۵۱)

دوسری جگہ فرماتے ہیں:

''نزول توراۃ کے بعد دنیا میں ایسے عذاب کم آئے۔ بجائے اہلاک سماوی کے جہاد کا طریقہ مشروع کر دیا گیا، کیونکہ کچھ لوگ احکام شریعت پر قائم رہا کیے۔'' (تفسیر عثمانی، ص ۵۱۹)

مولانا وحید الدین خان لکھتے ہیں:

''درحقیقت یہ اشاعت اسلام کی جدوجہد نہیں بلکہ منکرین رسالت کے اوپر اس خدائی فیصلہ کا ظہور تھا جس کو قرآن میں امر اللہ، حکم اللہ، وعد اللہ وغیرہ الفاظ میں بیان کیا گیا ہے اور جو ''احقاق حق'' اور ''ابطال باطل'' کے لیے ہوتا ہے۔ یہ اپنی اصل نوعیت کے اعتبار سے اسلام کے اصولوں کو منوانے کی کوشش نہیں تھی، بلکہ حقیقۃً اسلام کے اصولوں کو نہ ماننے کی سزا تھی جو زمین و آسمان کے مالک کی طرف سے ایک مخصوص شکل میں ان کے اوپر نافذ کی گئی تھی۔ یہ سزا ہر اس انسان کو لازماً ملنے والی ہے جو خدا کی ہدایت کو ماننے سے انکار کر دے۔ فرق صرف یہ ہے عام انسانوں کو قیامت میں ملے گی اور رسول کے براہ راست مخاطبین کو دنیا میں بھی ملتی ہے اور آخرت میں بھی۔

'ولنذيقنهم من العذاب الادنى دون العذاب الاكبر' (سجدہ ۲۱)

یہ صحیح ہے کہ اس فیصلہ الٰہی کے نفاذ سے من جملہ اور فائدوں کے، اسلام کو تبلیغی اور توسیعی فائدے بھی حاصل ہوئے، مگر یہ اس کے دیگر نتائج تھے، جس طرح ہر واقعہ کے بہت سے دیگر نتائج و اثرات ہوتے ہیں۔ جہاں تک حکم کی اصولی نوعیت کا تعلق ہے، وہ وہی تھی جو اوپر مذکور ہوئی۔'' (تعبیر کی غلطی، ص ۱۱۵، ۱۱۶)

قرآن مجید نے اسی پہلو سے انسانی دائرۂ اختیار کی تحدید عہد رسالت کے منافقین کے حوالے سے بھی واضح کی ہے۔ منافقین بھی منکرین حق کا ایک گروہ تھا جو بظاہر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ماننے والے گروہ میں شامل ہو کر درحقیقت ان کے خلاف سازشوں اور ریشہ دوانیوں میں مصروف تھا۔ بظاہر ایمان لے آنے کی وجہ سے انھیں دوسرے گروہوں کے مقابلے میں زیادہ مہلت دی گئی، تاہم اصولی طور پر وہ بھی خدا کے عذاب کے مستحق تھے اور

قرآن مجید میں بار بار یہ دھمکی دی گئی کہ اگر وہ اپنی روش سے باز نہ آئے تو خدا کے قانون کے مطابق وہ بھی اہل ایمان کے ہاتھوں خدا کے عذاب کی گرفت میں آ جائیں گے:

لَئِن لَّمْ يَنتَهِ الْمُنَافِقُونَ وَالَّذِينَ فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ وَالْمُرْجِفُونَ فِي الْمَدِينَةِ لَنُغْرِيَنَّكَ بِهِمْ ثُمَّ لَا يُجَاوِرُونَكَ فِيهَا إِلَّا قَلِيلًا ۔ مَلْعُونِينَ أَيْنَمَا ثُقِفُوا أُخِذُوا وَقُتِّلُوا تَقْتِيلًا. سُنَّةَ اللَّهِ فِي الَّذِينَ خَلَوْا مِن قَبْلُ وَلَن تَجِدَ لِسُنَّةِ اللَّهِ تَبْدِيلًا. (الاحزاب ۳۳: ۶۲)

لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انھیں سزا دینے کی کوئی صریح اجازت نازل نہیں ہوئی، اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت تک بطور ایک گروہ کے متحرک ہونے کے باوجود ان کے خلاف کسی قسم کا کوئی اقدام نہیں کیا گیا۔ اہل ایمان قرآن کے الفاظ میں 'وَنَحْنُ نَتَرَبَّصُ بِكُمْ أَن يُصِيبَكُمُ اللّٰهُ بِعَذَابٍ مِّنْ عِندِهِ أَوْ بِأَيْدِينَا' (توبہ ۹: ۵۲) کی کیفیت میں اس کے منتظر رہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کب اس کی اجازت ملتی ہے۔ چنانچہ آپ کی وفات کے موقع پر سیدنا عمر کو اس حقیقت کو تسلیم کرنے میں اسی لیے تردد پیش آیا تھا کہ منافقین کے اس گروہ پر عملاً یہ سزا ابھی تک نافذ نہیں ہوئی تھی اور چونکہ اس کا فیصلہ وحی ہی کی بنیاد پر کیا جا سکتا تھا، اس لیے ان کے خیال میں منافقین کو ان کے انجام سے دوچار کیے بغیر نبی صلی اللہ علیہ وسلم دنیا سے تشریف نہیں لے جا سکتے تھے۔ انھوں نے اس موقع پر کہا:

واللّٰہ ما مات رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ولا یموت حتی یقطع ایدی اناس من المنافقین کثیر وارجلھم. (دارمی، رقم ۱۶۱۶)

''بخدا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال نہیں ہوا اور جب تک آپ منافقین میں سے بہت کے ہاتھ پاؤں نہ کاٹ لیں، آپ کا انتقال نہیں ہو سکتا۔''

اس موقع پر سیدنا عمر اور عمومی طور پر صحابہ کی جماعت کو یہی اشکال اپنی اس ذمہ داری کے حوالے سے بھی پیش آیا جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے انھیں 'شہادت علی الناس' کے منصب پر فائز کر کے جزیرۂ عرب سے باہر کی اقوام پر اتمام حجت کرنے کے ضمن میں ان پر عائد کی تھی۔ طبری کی روایت ہے:

لما بویع ابوبکر فی السقیفة وکان الغد جلس ابوبکر علی المنبر فقام عمر فتکلم قبل ابی بکر فحمد اللّٰہ

''جب سقیفہ بنی ساعدہ میں ابوبکر کی بیعت کر لی گئی اور اگلا دن ہوا تو ابوبکر آ کر منبر پر بیٹھ گئے۔ ابوبکر کے بات کرنے سے پہلے عمر اٹھے اور انھوں نے گفتگو کی۔

واثنی علیه بما هو اهله ثم قال ایها الناس انی قد کنت قلت لکم بالامس مقالة ما کانت الا عن رایی وما وجدتها فی کتاب اللّٰه ولا کانت عهدا عهده الی رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم ولکنی قد کنت اری ان رسول اللّٰه سیدبر امرنا حتی یکون آخرنا. (الکامل فی التاریخ ۲۱۰/۳)

اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان کرنے کے بعد انھوں نے کہا: اے لوگو، کل میں نے تم سے ایک بات کہی تھی جو سراسر میری اپنی رائے تھی۔ نہ میں نے اس کو کتاب اللہ میں پایا اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے ساتھ ایسا کوئی وعدہ کیا تھا۔ بس میرا خیال یہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے امور کی دیکھ بھال کرتے رہیں گے اور ہم سب کے دنیا سے جانے کے بعد ہی آپ کا انتقال ہو گا۔''

ابن حبان کی روایت ہے:

اما بعد فانی قد قلت لکم امس مقالة لم تکن کما قلت وانی واللّٰه ما وجدتها فی کتاب انزله اللّٰه ولا فی عهد عهده الی رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم ولکنی کنت ارجو ان یعیش رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم حتی یدبرنا یقول حتی یکون آخرنا فاختار اللّٰه جل وعلا لرسوله الذی عنده علی الذی عندکم.

''اما بعد! میں نے کل تم سے ایک بات کہی تھی جو حقیقت میں اس طرح نہیں تھی جیسے میں نے کہی۔ بخدا میں نے وہ نہ تو اللہ کی اتاری ہوئی کتاب میں پائی اور نہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی ارشاد میں جو آپ نے مجھ سے فرمایا ہو۔ البتہ مجھے یہ توقع تھی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے معاملات کی تدبیر کے لیے زندہ رہیں گے، یعنی ہم سب کے بعد دنیا سے رخصت ہوں گے، لیکن اللہ نے اپنے رسول کے لیے تمھارے قرب کے بجائے اپنے قرب کو پسند کیا۔''

(ابن حبان، رقم ۶۶۲۰۔ مصنف عبدالرزاق، رقم ۹۷۵۶)

بعد میں ایک موقع پر انھوں نے عبداللہ بن عباس کے سامنے قرآن مجید میں اپنے اس استنباط کا ماخذ بھی بیان کیا۔ ابن عباس بیان کرتے ہیں:

واللّٰه انی لامشی مع عمر فی خلافته وهو عامد الی حاجة له وفی یده الدرة وما معه غیری قال وهو یحدث

''بخدا، ایک دن میں سیدنا عمر کی خلافت کے زمانے میں ان کے ساتھ چل رہا تھا اور وہ اپنے کسی کام سے جا رہے تھے اور درہ انھوں نے ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا اور

نفسه ويضرب وحشي قدمه بدرته قال اذ التفت الى فقال يابن عباس هل تدرى ما حملني على مقالتي هذه التي قلت حين توفى الله رسوله؟ قال قلت لا ادرى يا امير المومنين انت اعلم قال والله ان حملني على ذلك الا انى كنت اقرا هذه الآية ﴿وكذلك جعلناكم امة وسطا لتكونوا شهداء على الناس ويكون الرسول عليكم شهيدا﴾ فوالله انى كنت لاظن ان رسول الله سيبقى فى امته حتى يشهد عليها بآخر اعمالها فانه للذى حملنى على ان قلت ما قلت.

(الکامل فی التاریخ، ۲۱۱/۳)

میرے علاوہ ان کے ساتھ کوئی نہیں تھا۔ وہ اپنے آپ سے باتیں کیے جاتے تھے اور اپنا درہ اپنے دائیں پاؤں پر مارتے جاتے تھے۔ اچانک میری طرف پلٹے اور کہنے لگے، اے ابن عباس! کیا تمھیں پتہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے موقع پر میں نے جو بات کہی، اس کا سبب کیا تھا؟ میں نے کہا، اے امیر المومنین، مجھے پتہ نہیں، آپ بہتر جانتے ہیں۔ انھوں نے کہا، بخدا! اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ میں قرآن مجید میں جب یہ آیت پڑھتا تھا کہ 'وكذلك جعلناكم امة وسطا لتكونوا شهداء على الناس ويكون الرسول عليكم شهيدا' تو اس کا مطلب میں یہ سمجھتا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت کے مابین موجود رہیں گے اور اس بات کے گواہ بنیں گے کہ اس امت نے اپنی ذمہ داری کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا۔ بس یہی چیز تھی جس نے مجھے وہ بات کہنے پر آمادہ کیا جو میں نے اس موقع پر کہی۔''

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے موقع پر یہ رویہ نہ صرف سیدنا عمر کا تھا بلکہ صحابہ کا عمومی ردعمل بھی یہی تھا۔ ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن بیان کرتے ہیں:

اقتحم الناس على النبى صلى الله عليه وسلم فى بيت عائشة ينظرون اليه فقالوا: كيف يموت وهو شهيد علينا ونحن شهداء على الناس فيموت ولم يظهر على الناس؟ لا والله ما مات ولكنه رفع كما رفع عيسى بن مريم

''ام المومنین عائشہ کے حجرے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھنے کے لیے لوگوں کا ہجوم اکٹھا ہو گیا اور انھوں نے کہا کہ آپ کیسے انتقال کر سکتے ہیں جبکہ آپ ہم پر گواہ ہیں اور ہمیں لوگوں پر گواہ بنایا گیا ہے؟ تو کیا لوگوں پر غلبہ قائم ہونے سے پہلے ہی آپ وفات پا گئے؟ بخدا نہیں، آپ کا انتقال نہیں ہوا، بلکہ

صلى اللّٰه عليه وسلم وليرجعن وتوعدوا من قال انه مات ونادوا فى حجرة عائشة وعلى الباب: لا تدفنوه فان رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم لم يمت. (ابن سعد، الطبقات الکبری، ۲/۲۷۱)

آپ کو اسی طرح کچھ عرصے کے لیے اٹھایا گیا ہے جیسے عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کو اٹھایا گیا، اور آپ لازماً واپس آئیں گے۔ اور انھوں نے ان لوگوں کو ڈانٹنا شروع کر دیا جو کہہ رہے تھے کہ آپ کا انتقال ہو گیا ہے۔ انھوں نے ام المومنین کے حجرے میں اور دروازے پر یہ اعلان کیا کہ آپ کو دفنانا مت، کیونکہ آپ کا انتقال نہیں ہوا۔''

چونکہ 'شہادت علی الناس' کے منصب کی رو سے صحابہ کرام پر دنیا کی اقوام کے سامنے حق کی گواہی دینے اور ان پر اسلام کا غلبہ قائم کرنے کی ذمہ داری عائد کی گئی تھی اور یہ عمل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش گوئیوں کے مطابق ایک مخصوص جغرافیائی دائرے میں ایک محدود مدت کے اندر پایہ تکمیل کو پہنچنا تھا، اس لیے صحابہ کا خیال یہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جن قوموں کے سربراہوں کو خطوط لکھ کر ان پر حجت تمام کر دی اور 'شہادت علی الناس' کی ذمہ داری کو ادا کرنے کے لیے ان کے خلاف جنگ کا اقدام کرنے کی اجازت دے دی ہے، اسے خود اپنی زندگی میں اور اپنی نگرانی میں مکمل کرائیں گے، لیکن آپ کی وفات سے یہ بات ان پر واضح ہوئی کہ ان کا یہ استنباط درست نہیں تھا۔ اس سے واضح ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھی اہل ایمان کو بھی منکرین حق کے خلاف قتال کا حق انسانی دائرۂ میں اختیار میں نہیں، بلکہ خدا کے دیے ہوئے اذن کے تحت خدا ہی کے نامزد کردہ گروہوں کے خلاف دیا گیا تھا اور منکرین حق کے خلاف اقدام کے حوالے سے انسانی دائرۂ اختیار کی تحدید اور خدا کے اذن کی شرط صحابہ کرام پر پوری طرح واضح تھی۔

اوپر کی سطور میں ہم نے جو بحث کی ہے، اس سے فقہا اور مفسرین کے اس عام نقطہ نظر کی غلطی بھی واضح ہو جاتی ہے جس کی رو سے منکرین حق کے خلاف قتال کے احکام نازل ہونے کے بعد وہ تمام نصوص جن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دینی ذمہ داری کو ابلاغ و تبلیغ تک محدود قرار دیا یا محارب و غیر محارب کفار کے مابین فرق کرنے کی ہدایت کی گئی ہے، کالعدم اور منسوخ قرار پا گئی ہیں اور اب اہل ایمان کی دینی و شرعی ذمہ داری کی تعیین و تحدید میں ان کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہی۔ ہم نے واضح کیا ہے کہ یہ ہدایات عام انسانی اخلاقیات کے دائرے میں اہل ایمان کی ذمہ داری اور اس کے حدود کا تعین کرتی ہیں اور اس دائرے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل ایمان اول و آخر اسی کے پابند

تھے کہ دین کے معاملے میں کسی فرد یا گروہ تک حق کا پیغام پہنچا دینے کے بعد اس کے ساتھ جبر و اکراہ کا طریقہ ہرگز اختیار نہ کریں، نیز اہل ایمان کے دشمن گروہوں اور غیر جانب دار کفار کے مابین فرق کو ملحوظ رکھیں اور اگر کوئی گروہ مسلمانوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرتا ہے تو اس کے ساتھ بر و قسط ہی کا معاملہ کیا جائے، بلکہ اگر کوئی گروہ میدان جنگ میں آ جانے کے باوجود مسلمانوں کے خلاف قتال پر آمادہ نہیں بلکہ صلح کی طرف مائل ہے تو اس کے خلاف کوئی اقدام نہ کیا جائے۔ عمومی انسانی اخلاقیات کے دائرے میں ان ہدایات میں کوئی نسخ واقع نہیں ہوا، بلکہ پوری طرح محکم اور قیامت تک کے لیے قابل عمل ہیں۔ صحابہ اور تابعین کے ہاں حکم کے اس تغیر کے لیے 'نسخ' کی تعبیر اختیار کی گئی ہے جو لفظ کے لغوی اور ظاہری مفہوم کے لحاظ سے درست ہے، لیکن اس کو متاخرین کے اصطلاحی مفہوم یعنی ''حکم کے بالکلیہ ازالہ'' کے اعتبار سے نسخ نہیں کہا جا سکتا، کیونکہ 'نسخ' کا معنی کسی حکم کو اپنی اصل اساس کے اعتبار سے کالعدم قرار دینے یا اس میں تخصیص وتحدید پیدا کر دینا ہے۔ اس اعتبار سے دین میں جبر و اکراہ کی نفی کرنے اور کفار کے ساتھ مصالحانہ تعلقات کی اجازت دینے والے نصوص 'نسخ' کے دائرے میں آ ہی نہیں سکتے، اس لیے کہ وہ ایک اخلاقی اصول پر مبنی ہیں جن میں نسخ واقع نہیں ہو سکتا۔ یہ درحقیقت ایک مخصوص صورت حال میں ایک اخلاقی اصول پر دوسرے اخلاقی اصول کی ترجیح کا مسئلہ ہے جس سے پہلے اخلاقی اصول کے فی نفسہ کالعدم قرار پانے کا نتیجہ اخذ نہیں کیا جا سکتا۔

یہ ایسے ہی ہے جیسے مثال کے طور پر سیدنا خضر نے خدا کے حکم پر ایک بے گناہ بچے کو قتل کر دیا۔ جہاں تک عام انسانی اخلاقیات کا تعلق ہے، وہ اس کا فیصلہ کرنے کے مجاز نہیں تھے اور سیدنا موسیٰ نے اسی بنا پر ان کے اس عمل پر اعتراض کیا تھا، لیکن خدا کی طرف سے اس لڑکے کو قتل کرنے کا حکم ملنے کے بعد ان کے لیے عام اخلاقی اصول کے بجائے خدا کے حکم کی پیروی کرنا لازم ہو گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس سے ایک عمومی اخلاقی اصول کے طور پر قتل نفس کی حرمت پر کوئی زد نہیں پڑی۔ یہ حرمت اپنی جگہ پہلے کی طرح برقرار رہی اور سیدنا خضر اس لڑکے کے علاوہ دوسرے انسانوں کے حوالے سے اسی کے پابند تھے۔ بالکل یہی معاملہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اتمام حجت کے بعد انکار حق پر قائم رہنے والے گروہوں کا تھا۔ عام انسانی اخلاقیات کی رو سے مسلمان ان میں سے صرف ان گروہوں کے خلاف جنگ کا اختیار رکھتے تھے جو فتنہ وفساد کے مرتکب ہوں۔ ان کے علاوہ باقی گروہوں کے خلاف انھیں کوئی اقدام کرنے کا حق حاصل نہیں تھا اور نہ صرف یہ کہ وہ اپنی مصلحت کے لحاظ سے ان میں سے جس گروہ کے ساتھ مصالحانہ تعلقات قائم کرنا چاہتے، کر سکتے تھے بلکہ ان میں سے جو گروہ ان کے ساتھ بر و قسط کا رویہ اپناتے، ان کے ساتھ بر و قسط ہی کا معاملہ کرنے کے پابند بھی تھے۔ تاہم جب اللہ تعالیٰ نے اپنے قانون کے تحت یہ فیصلہ فرمایا کہ

پیغمبر کی طرف سے حجت تمام کر دیے جانے کے باوجود جن گروہوں نے کفر پر قائم رہنے کا فیصلہ کیا ہے، وہ خدا کے عذاب کے مستحق ہیں جو خدا نے اہل ایمان کی تلواروں کے ذریعے سے ان پر نافذ کرنے کا فیصلہ کیا ہے تو اب اہل ایمان خدا کے اس فیصلے کے تحت، نہ کہ عمومی اخلاقی اصولوں کے فی نفسہ منسوخ ہو جانے کی وجہ سے، اس کے پابند تھے کہ کفار کے ساتھ مصالحانہ تعلقات کو ختم کر کے ان کے ساتھ جنگ کریں اور ان میں جس گروہ کے لیے خدا نے قتل یا محکومی کی صورت میں جو سزا مقرر کی ہے، وہ کسی رو رعایت کے بغیر اس پر نافذ کر دیں۔ یہ حکم اللہ تعالیٰ کے ایک خصوصی قانون پر مبنی تھا جس کے مطابق وہ اپنے پیغمبروں کے ذریعے سے اتمام حجت کے بعد منکرین حق کو قتل واسارت یا محکومی کی صورت میں ان کے کفر کی سزا دیتا ہے۔ یہ معاملہ سرتا سر اللہ کے فیصلے اور اس کے اذن پر منحصر ہوتا ہے اور اس میں کسی انسان کو اپنے تئیں کوئی فیصلہ کرنے کا حق حاصل نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس پرامن اور صلح جو کفار کے ساتھ مصالحانہ تعلقات کی اجازت عام انسانی اخلاقیات پر مبنی ہے اور اس دائرے میں اس میں کوئی نسخ واقع نہیں ہوا بلکہ وہ شریعت کے ایک محکم حکم کی حیثیت رکھتی ہے۔



---

گزشتہ صفحات میں ہم نے عہد نبوی و عہد صحابہ میں جہاد و قتال کے مختلف پہلوؤں پر جو بحث کی ہے، اس کا حاصل درج ذیل نکات کی صورت میں بیان کیا جا سکتا ہے:

۱۔ منصب رسالت پر فائز کوئی ہستی جب کسی قوم میں مبعوث کر دی جاتی ہے تو اس فیصلے کے ساتھ کی جاتی ہے کہ رسول اور اس کے پیروکار اپنے مخالفوں پر بہر حال غالب آ کر رہیں گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جزیرہ نمائے عرب میں مبعوث کیا گیا تو اس سنت الٰہی کے مطابق یہ دوٹوک اعلان کر دیا گیا کہ آپ کی مخالفت کرنے والے تمام مذاہب کے پیروکاروں کے لیے مغلوبیت اور محکومیت مقدر ہو چکی ہے۔

۲۔ اس غلبے کے حصول کی حکمت عملی میں دعوت و تبلیغ کے ساتھ ساتھ 'جہاد و قتال' بھی ایک لازمی عنصر کے طور پر شامل تھا، چنانچہ یہ ہدف 'ویکون الدین للّٰہ' کے الفاظ میں آغاز ہی میں واضح کر دیا گیا تھا۔ البتہ اس وعدے کا عملی ظہور دو مرحلوں میں ہوا۔ جزیرۂ عرب کی حد تک تو اس دین کو خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں غالب کر دیا گیا، چنانچہ مدنی عہد نبوت میں غلبہ دین کی جدوجہد مختلف ادوار سے گزرنے کے بعد جب اپنے آخری مراحل کو پہنچی تو باطل ادیان پر دین حق کے غلبہ کی دو صورتیں متعین طور پر واضح کر دی گئیں۔ مشرکین کے لیے تو لازم کیا گیا کہ وہ دائرۂ اسلام میں داخل ہو جائیں، ورنہ انھیں قتل کر دیا جائے گا، جبکہ اہل کتاب سے کہا گیا کہ وہ جزیہ دے کر مسلمانوں

کی محکومی اور زیردستی قبول کر لیں۔ جزیرۂ عرب سے باہر روم، فارس اور مصر کی سلطنتوں تک اس غلبے کی توسیع کی ذمہ داری صحابہ کرام پر عائد کی گئی جنھیں اس مقصد کے لیے 'شہادت علی الناس' کے منصب پر فائز کیا گیا تھا۔

۳۔ قانون رسالت کی رو سے پیغمبر کی مخاطب اقوام پر مذکورہ سنت الٰہی کا نفاذ خدا کے براہ راست اذن کے تحت کیا جاتا ہے اور اس میں انسانوں حتیٰ کہ پیغمبروں کے اجتہادی فیصلے کا بھی کوئی دخل نہیں ہوتا۔ مزید یہ کہ رسول اور اس کے پیروکاروں کا یہ غلبہ پوری دنیا کی قوموں پر نہیں، بلکہ ان مخاطبین پر ہوتا ہے جن پر اتمام حجت کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے سزا نافذ کرنے کا اذن مل جاتا ہے۔ اس اصول کے تحت نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے متبعین نے جو جہاد کیا، وہ غلبۂ دین کے اسی وعدے کی تکمیل کے لیے اور انھی اقوام تک محدود تھا جن کے خلاف اقدام کی اجازت اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی گئی تھی اور جن کی تعیین نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سربراہوں کو خطوط لکھ کر، کر دی تھی۔ چنانچہ اسلامی تاریخ کے صدر اول میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے پیروکاروں کے ہاتھوں جزیرۂ عرب اور روم و فارس کی سلطنتوں پر دین حق کا غلبہ قائم ہو جانے کے بعد غلبۂ دین کے لیے جہاد و قتال کے حکم کی مدت نفاذ خود بخود ختم ہو چکی ہے۔ یہ شریعت کا کوئی ابدی اور آفاقی حکم نہیں تھا اور نہ اس کا ہدف پوری دنیا پر تلوار کے سائے میں دین کا غلبہ اور حاکمیت قائم کرنا تھا۔ اس کے بعد قیامت تک کے لیے جہاد و قتال کا اقدام دین کے معاملے میں عدم اکراہ اور غیر محارب کفار کے ساتھ جنگ سے گریز کے ان عمومی اخلاقی اصولوں کے دائرے میں رہتے ہوئے ہی کیا جائے گا جو قرآن مجید کے نصوص میں مذکور ہیں۔

(باقی)

ریحان احمد یوسفی

# Idiot Box

آج کل یہ بات عام طور پر کہی جا رہی ہے کہ ٹیلیوژن کے آنے کے بعد کتاب اور قلم کا زمانہ ختم ہو گیا ہے۔ اس کا سبب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ عصر حاضر میں الیکٹرونک میڈیا کے عام ہونے کے بعد مطالعے کا رواج بہت کم ہو گیا ہے۔ یہ بات ہماری سوسائٹی کے اعتبار سے ٹھیک ہے مگر اہل مغرب کے ہاں آج بھی کتاب علم سیکھنے کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ ان کے ہاں الیکٹرونک میڈیا خبر، کھیل اور تفریح (Infotainment) کے معاملے میں تو یقیناً بہت زیادہ موثر ہو گیا ہے مگر علم کی دنیا میں آج بھی کتاب و قلم کی حکمرانی ہے۔ ان کے ہاں ٹیلیوژن کو Idiot Box کہا جاتا ہے۔ اس یقین کی بنا پر کہ بہت زیادہ ٹیلیوژن دیکھنا انسان کی ذہنی سطح کو کم تر کر دیتا ہے۔

Watching too much television causes stupidity.

یہ بات بالکل ٹھیک ہے۔ کیونکہ ٹیلیوژن دیکھنے کے عمل میں انسان اپنی عقل کو، جو اس کا اصل شرف ہے، بہت کم استعمال کرتا ہے۔ جبکہ مطالعہ کرنا ایک بھرپور ذہنی ورزش ہے جس میں انسان کی علمی و عقلی صلاحیتیں بے پناہ بڑھ جاتی ہیں۔

ٹیلیوژن دیکھنے والے شخص کے مقابلے میں کتاب پڑھنے والا شخص اپنے ذہن کا بہت زیادہ استعمال کرتا ہے۔ جب وہ الفاظ پڑھتا ہے تو ان کے معنی سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر بات سمجھ میں نہ آئے تو دو تین دفعہ رک کر دیکھتا ہے۔ اپنے تخیل کو استعمال کر کے وہ ان کو تصورات میں تبدیل کرتا ہے۔ ان کا تجزیہ کرتا ہے۔ الفاظ نئے ہوں تو ڈکشنری سے ان کے معنی دریافت کرتا ہے۔ اس طرح نہ صرف اس کا علم بڑھتا ہے بلکہ اس کی تخیلاتی طاقت (Imagination Power) اس عمل سے مضبوط ہوتی ہے۔ اس کی تجزیہ (Analysis) کرنے کی صلاحیت

بڑھتی ہے۔ چیزوں کو سمجھنے اور اخذ کرنے کی استعداد میں بے پناہ اضافہ ہو جاتا ہے۔

جبکہ مطالعہ نہ کرنے اور صرف ٹیلیوژن پر انحصار کرنے والا کبھی اس عمل سے نہیں گزرتا۔ وہ اس Idiot Box پر ہر چیز اپنے سامنے مجسم دیکھتا ہے۔ ہر پیغام اور ہر واقعہ آواز، تصویر، رنگ اور روشنی کی مدد سے اس طرح اس کے سامنے برہنہ ہو کر آجاتی ہے کہ عقل کا استعمال کرنے کی ضرورت بہت کم ہو جاتی ہے۔ آہستہ آہستہ اس کی ذہنی صلاحیت کو زنگ لگنا شروع ہو جاتا ہے۔ اور آخر کار وہ اتنی کم زور ہو جاتی ہے کہ وہ حق و باطل اور صحیح و غلط کے درمیان فیصلہ کرنے کی صلاحیت ہی کھو بیٹھتا ہے۔ اس کی زندگی بس سنی سنائی باتوں میں گزرنے لگتی ہے۔

یہ ہماری قوم کی بدقسمتی ہے کہ ہمارے ہاں مطالعے کی روایت جو پہلے ہی بہت کمزور تھی اب کم و بیش ختم ہوتی جا رہی ہے۔ لوگ اول تو اپنی معاشی اور معاشرتی مصروفیات ہی سے وقت نہیں نکال پاتے۔ اور جو وقت انھیں ملتا بھی ہے وہ ٹیلیوژن کے چینل بدلتے ہوئے گزر جاتا ہے۔ لوگ بڑے فخر سے بتاتے ہیں کہ ان کے پاس مطالعے کا وقت نہیں ہے یا پھر مطالعہ کرنا انھیں بہت مشکل لگتا ہے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے کہ جیسے کوئی شخص بڑے فخر سے بتائے کہ وہ ورزش نہیں کرتا۔ ایسے شخص کا جسم بے ڈول اور دل کمزور ہو جاتا ہے۔ اسی طرح مطالعہ نہ کرنے والے اور ٹیلی وژن کے چینل بدلتے رہنے والے افراد ذہنی طور پر اسمارٹ نہیں رہتے۔ ذہنی طور پر پسماندہ ہو جاتے ہیں۔ ذہنی پسماندگی کی اس سے بڑی نشانی کیا ہو سکتی ہے کہ لوگ خود اپنی جہالت کو فخریہ طور پر بیان کرنے لگیں۔

اجتماعی طور پر جس قوم کے افراد میں مطالعہ کی عادت ختم ہو جائے وہاں علم کی روایت کمزور ہو جاتی ہے۔ علم کی مضبوط روایت کے بغیر دنیا کی کوئی قوم ترقی نہیں کر سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری قوم اپنی بے پناہ صلاحیتوں کے باوجود دنیا میں بہت پیچھے ہے۔

ہمارے ہاں بدقسمتی سے ٹیلیوژن کے سامنے کتاب کو شکست ہو رہی ہے۔ یہ شکست زندگی کے ہر میدان میں ہماری شکست کا سبب بن سکتی ہے۔ یہ نوشتہ دیوار Wrting of Wall ہے۔ مگر کیا کیجیے اسے پڑھنے کے لیے بھی مطالعے کی عادت ہونی چاہیے جو بدقسمتی سے ہم میں نہیں۔

ایسے میں ہر باشعور شخص کی ذمہ داری ہے کہ وہ مطالعے کی عادت کو فروغ دینے کے لیے کوشش کرے۔ آج اس سے بڑی کوئی قومی خدمت ممکن نہیں۔

---

# بس یہی دل

پچھلے دنوں مجھے ایک تقریب میں شرکت کا اتفاق ہوا جس کا انعقاد ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں کیا گیا تھا۔ یہ تقریب جس ہال میں منعقد کی گئی تھی اس کا ماحول بہت مسحور کن تھا۔ وسیع ہال، بڑے بڑے خوبصورت فانوس، دبیز قالین، ٹھنڈی فضا، خوش رنگ پردے اور دیواریں اور ان سب کے ساتھ ایک پرتکلف عشائیہ۔

میں اس محفل میں بیٹھا یہ سوچ رہا تھا کہ اس طرح کے ماحول میں ایسی محافل دنیا بھر میں عام ہوتی ہیں۔ مگر ان میں ہر کس و ناکس کو داخلے کی اجازت نہیں ہوتی۔ ایسی جگہوں پر داخلے کی ایک قیمت ہوتی ہے جو صرف نامور، باصلاحیت، صاحب حیثیت اور بااثر لوگ ہی دے سکتے ہیں۔ معاشرے کے عام افراد کی پہنچ سے یہ سب کچھ ساری زندگی باہر ہی رہتا ہے۔

ایسے میں مجھے خیال آیا کہ مالک کائنات جب اپنی جنت بنائے گا تو یقیناً وہ دنیا کی ان تمام نعمتوں سے زیادہ حسین ہوگی۔ مگر اس جنت کی خوبیوں میں سے سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں داخلہ کے لیے کوئی مال، کوئی نام، کوئی صلاحیت اور کوئی اثر ورسوخ نہیں چاہیے۔ جنت کی حسین وادی، اس کی پرلطف محفلوں، اس کی ابدی بادشاہی اور اس کی غیر فانی نعمتوں کے حصول کی قیمت کچھ نہیں۔ بس اک ٹوٹا ہوا دل —— رب کی عظمت کے احساس سے پاش پاش دل۔ یہی جنت کی قیمت ہے۔

وہ دل جس میں اخلاص ہو۔ رب کی سچی چاہت ہو۔ اس کی اطاعت کا جذبہ ہو۔ اس کے نام پر مر مٹنے کی خواہش ہو۔ اس کے عہد کی پاسداری ہو۔ اس سے وفا کا عزم ہو۔ اس کی رحمت کی امید ہو۔ اس کی پکڑ کا خوف ہو۔ اس سے ملاقات کا شوق ہو۔ اس کے رسول کی محبت ہو۔ اس کے دین کی حمیت ہو۔ اس کی فردوس کی رغبت ہو۔ بس یہی —— بس یہی دل چاہیے۔

لوگ ٹوٹی ہوئی چیزیں پھینک دیتے ہیں۔ مگر خدا ٹوٹے ہوئے دل کو سب سے زیادہ پسند کرتا ہے۔ اتنا زیادہ کہ اس کے بدلے میں اپنی سب سے بڑی نعمت — فردوس کی ابدی بادشاہی — دینے کے لیے تیار ہے۔ مگر کیا کیجیے کہ آج لوگوں کے پاس ساری دینداری ہے —— یہی ٹوٹا ہوا دل نہیں۔

---

# بادشاہوں کا بادشاہ

حضرت سلیمان علیہ السلام ایک مشہور نبی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں اپنے زمانے کا سب سے بڑا بادشاہ بنایا تھا۔ جنوں، پرندوں اور ہواؤں کو بھی ان کا تابع فرمان کر دیا تھا۔ وہ پرندوں یہاں تک کہ چیونٹیوں کی باتیں بھی سمجھ لیتے تھے۔ ان کے دربار میں ایسے باکمال لوگ موجود تھے جو ان کے حکم پر ہزار میل دور موجود ایک چیز کو لمحہ بھر میں ان کے دربار میں پہنچا دیتے تھے۔ مگر اس سب کے باوجود وہ لمحہ بھر غافل نہ رہتے اور ہر لمحے رب کا شکر ادا کرتے رہتے۔

قرآن پاک کی سورہ نمل میں یہ ساری تفصیلات بیان ہوئی ہیں۔ اسی سورہ میں یہ واقعہ بھی بیان ہوا ہے کہ ان کے لشکر میں موجود پرندے ہدہد نے ایک روز انھیں یہ اطلاع دی کہ یمن کی قوم سبا پر ایک عورت حکمران ہے جو بڑی شان وشوکت کی مالک ہے۔ البتہ وہ اور اس کی قوم شرک کا شکار ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام، جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس خدمت پر معمور تھے کہ شرک کو ختم کر دیں، انھیں جب یہ اطلاع ملی تو آپ نے ہدہد کے ذریعے سے اسے ایک خط پہنچوایا کہ فرمانبرداری کے ساتھ فوراً میری خدمت میں حاضر ہو۔

جب ملکہ سبا کو حضرت سلیمان علیہ السلام کا خط ملا تو اس نے اپنے درباریوں سے مشورہ کیا۔ وہ ایک طاقتور قوم کے سردار تھے اس لیے اپنی ملکہ کو جنگ کا مشورہ دیا۔ اس پر ملکہ سبا نے جو حضرت سلیمان علیہ السلام کی طاقت سے واقف اور بہت سمجھدار خاتون تھی، اپنا وہ تاریخی جملہ کہا جو انسان کی ہزاروں سالہ سیاسی زندگی کا نچوڑ ہے۔ قرآن نے اس کی بات کو اس طرح بیان کیا ہے۔

> ''بادشاہ لوگ جب کسی بستی میں (فتح کے بعد) داخل ہوتے ہیں تو وہاں فساد برپا کر دیتے ہیں اور وہاں کے معززین کو ذلیل کر کے چھوڑتے ہیں۔'' (نمل ۲۷: ۳۴)

ملکہ سبا کا یہ جملہ بادشاہوں کے اس رویے کو بیان کرتا ہے جو ہمیشہ سے ان کا معمول رہا ہے۔ بادشاہ جب کسی ملک پر قبضہ کر لیتے ہیں تو ان کی طاقت کو یہ گوارہ نہیں ہوتا کہ کوئی ان کے خلاف اٹھنے کی جرأت کرے۔ اس لیے جو کوئی ایسا کرنے کی کوشش کرتا ہے وہ اسے کچل کر رکھ دیتے ہیں اور خاص طور پر وہاں کے عزت دار لوگ، جن کی طرف سے بغاوت کا اندیشہ سب سے بڑھ کر ہوتا ہے، انھیں ذلیل اور بے وقعت بنا کر رکھتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ اس کائنات کے بادشاہ ہیں۔ وہ بادشاہوں کے بادشاہ ہیں۔ ان کی سنت بھی اس معاملے میں دوسرے بادشاہوں سے کچھ مختلف نہیں۔ تاہم، اللہ تعالیٰ کو کسی عام بستی کو فتح کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ بادشاہ کی حیثیت

سے اگر داخل ہوتے ہیں تو دل کی دنیا میں داخل ہوتے ہیں۔ پھر اس کے بعد وہ دل کی اس بستی میں وہی کچھ کرتے ہیں، جو دوسرے بادشاہ اپنے مفتوحہ علاقوں میں کرتے ہیں۔

وہ اس بستی میں ہر اس تعمیر کو گرا دیتے ہیں جس میں دنیا کی محبت آباد ہوتی ہے۔ وہ ہر اس عمارت کو مسمار کر دیتے ہیں جس میں غیر اللہ کا بسیرا ہوتا ہے۔ وہ ان قلعوں اور چھاؤنیوں کو تاراج کر دیتے ہیں جو نفس و شیطان کی پناہ گاہ ہوتی ہیں۔ وہ خواہشات کے اس محل سرا کو ویران کر دیتے ہیں جس میں دنیا پرستی کا ڈیرا ہوتا ہے۔ وہ دل کی دنیا کے ہر عزت دار کو اس طرح ذلیل و رسوا کرتے ہیں کہ وہ کبھی سر اٹھانے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ مال و دولت، عزت و شہرت، جمال و کمال، آسائش و زیبائش کے وہ بت جن کی پرستش ہر دل میں کی جاتی ہے، اس بستی میں خدائے ذوالجلال کی دہشت سے منہ چھپائے پھرتے ہیں۔

اس کے بعد انسان چاہے سلیمان علیہ السلام کی طرح کا بادشاہ ہی کیوں نہ ہو، دنیا میں ہر طرف سے گھرا، ہی کیوں نہ ہو، اس کا دل خدا کی جاگیر بن جاتا ہے۔ اس مفتوحہ دل میں ہر طرف خدا کی عظمت کا راج ہوتا ہے۔ اسی کی بڑائی کے نغمے گائے جاتے ہیں۔

یہی تاراج دل ٹوٹا ہوا دل ہے ـــــ یہی وہ دل ہے جو آج نایاب ہو چکا ہے۔

---

محمد وسیم اختر مفتی

# گالی اور غصہ



گالیاں کچھ لوگوں کا تکیہ کلام ہوتی ہیں، وہ بات بے بات گالیوں کی بوچھاڑ کرتے جاتے ہیں۔ غصہ آئے تو بھی گالیاں نکالتے ہیں، نہ آئے تو بھی ان کے منہ سے گالیاں ہی جھڑتی رہتی ہیں۔ ان کرداروں کو چھوڑ کر دیکھا جائے تو عام طور پر غصہ ہی گالیاں اور مغلظات بکنے کا باعث بنتا ہے۔ جب غصے میں بھوت بنا ہوا شخص اپنے مدمقابل کی ماں، بہنوں پر گندے اور فحش الزام لگا لیتا ہے اور اپنے تئیں اس کے حسب ونسب کو اچھی طرح مشکوک ثابت کر دیتا ہے تو اس کا کلیجا ٹھنڈا ہوتا ہے۔ صرف پنجابی زبان کا معاملہ نہیں، دنیا کی ہر زبان میں فصیح اور کٹیلی گالیاں تخلیق کی گئی ہیں۔ ان کا نمایاں وصف معتوب انسان کو بد اصل ثابت کرنا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے اس بیچارے کی ماں کو بدکردار بنائے بغیر ایسا نہیں کیا جا سکتا لہٰذا عام طور پر ماں ہی گالیوں کا محور بنی رہتی ہے۔ ماں بہنوں کی برائی کرنے کے علاوہ خود معتوب کو کتا، سؤرا اور دوسرے برے القاب سے نوازا جاتا ہے۔

ایک مسلمان کے شایاں نہیں کہ وہ گالی گلوچ کرے۔ جو زبان اللہ کے شکر سے تر رہنی چاہیے، گالی اس پر نہیں جچتی۔ پھر غصے سے بے قابو ہو جانا جانوروں کا وصف ہے، عقل وشعور رکھنے والا آدمی کسی لمحہ عقل کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ تیسری بات کہ کسی پاک دامن عورت پر گالی کی صورت میں تہمت لگانا سخت گناہ ہے۔ ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک بار انصار مدینہ کی ایک مجلس میں تشریف لے گئے۔ وہاں ایک شخص بیٹھا ہوا تھا جس کے بارے میں مشہور تھا، وہ گندی اور فحش باتیں کرتا ہے اور جلد ہی گالیوں پر اتر آتا ہے۔ آپؐ نے فرمایا، ''مومن کو گالی

دینا گناہ ہے اور اس سے جنگ کرنا کفر ہے۔''اس شخص نے وعدہ کیا، بخدا! آئندہ میں گالی نہ نکالوں گا۔ گالیوں میں دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے جو تہمتیں دھری جاتی ہیں اور گندے الزامات لگائے جاتے ہیں ان کا برا ہونا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے واضح ہوتا ہے، ''کوئی شخص کسی دوسرے پر گناہ گار ہونے کا جھوٹا الزام یا کفر کی تہمت نہیں لگاتا مگر دوسرے میں برائی موجود نہ ہونے کی صورت میں وہ الزام اسی پر چسپاں ہو جاتا ہے۔''

آپؐ نے فرمایا، ''مسلمان کو لعنت ملامت کرنا اسے قتل کرنے کی مانند ہے۔'' ایک تابعی ابو عبداللہ بجلی نے ام المومنین سیدہ عائشہؓ سے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کے بارے میں دریافت کیا تو انھوں نے فرمایا، ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گفتگو میں حد سے نہ بڑھتے، وہ کبھی فحش بات نہ کرتے، بازار میں شوروغوغا نہ کرتے، برائی کا بدلہ برائی سے نہ دیتے۔ وہ تو معاف اور درگزر کرنے والے تھے۔'' یہ ایسی برائیاں ہیں کہ اللہ کے پاک نبیؐ میں ان کے پائے جانے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا لیکن چونکہ عام لوگوں کی اکثریت ان میں مبتلا ہے اس لیے ام المومنینؓ نے ان کی نفی وضاحت کے ساتھ کی۔ بدزبانی اور گالم گلوچ سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ غصے پر قابو پانا سیکھا جائے۔

غصہ ایسی شے ہے جو انسان کے جسم اور دماغ پر حاوی ہو جاتا ہے، اس سے ہر انسانی عضو کی کارکردگی (physiology) متاثر ہوتی ہے۔ دماغ کا سوچنے سمجھنے والے حصہ (cerebral cortex) اپنا کام شروع بھی نہیں کرتا کہ غصے کا اظہار کرنے والا حصہ (amygdala) عمل میں آ جاتا ہے۔ غصہ کھانے والے شخص کے پٹھے کھچ جاتے ہیں، اس کی سانس تیز تیز چلنے لگتی ہے، دل کی دھڑکن اور بلڈ پریشر تیز ہو جاتے ہیں، کبھی وہ کانپنے بھی لگتا ہے۔ ان لمحات میں وہ توانائی سے پر ہوتا ہے اور کوئی قدم اٹھا سکتا ہے، وہ ایسا عمل بھی کر سکتا ہے جس پر اسے بعد میں خود نادم ہونا پڑے۔ اس موقع پر اگر اس کی سوچ سمجھ غالب آ جائے تو وہ غصے پر قابو پا سکتا ہے ورنہ غصہ اپنا کام کر دکھاتا ہے۔ جس شخص سے بے انصافی ہوئی ہو یا اس کی حق تلفی کی گئی ہو، اسے جلد غصہ آتا ہے۔ ماہرین نفسیات کہتے ہیں، غصہ کسی پیش آنے والے خطرے کا ردعمل ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے یہ خطرہ انسان کی اپنی ذات کو درپیش ہو یا کسی ایسے شخص کو جس سے وہ محبت کرتا ہو۔ یہ خطرہ حقیقی ہو سکتا ہے اور خیالی بھی۔ بھوک، تکلیف اور بیماریاں بھی غصہ پیدا کرتی ہیں۔ انیسویں صدی میں فرائڈ نے کہا، جب انسان کو محبت نہیں ملتی تو وہ غصے کا شکار ہو جاتا ہے۔ اگرچہ عام طور پر غصے کا اظہار گالی گلوچ، مار پیٹ اور قتل و غارت کی صورت میں ہوتا ہے لیکن کبھی غصہ کھانے والا خاموشی کا سہارا بھی لیتا ہے۔ اس صورت میں اس کا رویہ تناؤ (tension) اور نفرت ظاہر کرتا ہے۔

غصے کے اثرات سے بچنے کے لیے غصے کا باعث بننے والی وجوہات کو دور کرنا ضروری ہوتا ہے۔ چونکہ عام طور پر

یہ انسان کے بس میں نہیں ہوتا اس لیے غصے کو کنٹرول کرنا ہی اہم ترین ذریعہ رہ جاتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ''دوسرے کو پچھاڑنے والا بہادر نہیں ہوتا، بہادر تو وہ ہے جو غصے کے وقت اپنے اوپر قابو رکھے۔'' ایک صحابیؓ نے آپؐ سے نصیحت کرنے کی درخواست کی تو آپؐ نے فرمایا، ''غصہ نہ کیا کرو! آپؐ نے یہ ارشاد کئی بار دہرایا''